چھٹا باب

شک

بینچ پر اُسکے برابر بیٹھے نوید کا چہرہ سمندر کی جانب تھا، خاموشی کا طویل وقفہ دونوں کے درمیان حائل ہوا۔ پچھلی دو ملاقاتوں میں وہ نوید سے مخاطب ہونا چاہتا تھا، لیکن اُس سے بات نہ ہو سکی، اور آج وہ ساتھ بیٹھا تھا لیکن پھر بھی بات کرنے کو الفاظ نہ مل رہے تھے۔ ذہن پہلے ہی بھٹکا ہوا تھا، انجان قاتل، موت کا پیغام، فاطمہ کی آمد اور احمد سے ملنے کا مطالبہ، ہر شے گڈمڈ ہو رہی تھی۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ذہن بھٹک کے پھر سے فاطمہ آفندی کے گرد گھومنے لگا۔

''کیا کرتا میں؟ تمہیں دیکھتے ہی گلے لگا کر خیر مقدم کرتا تمہارا؟'' علی چونکا۔ وہ اُسکے شکوے کا جواب دے رہا تھا۔ چہرہ ہنوز سمندر کی جانب تھا۔

''میں نے شکایت تو نہیں کی؟ بس جاننا چاہتا تھا کہ آج کیا وجہ ہوئی کہ تم مجھے دیکھ کر رک گئے؟'' آہستہ آواز میں وضاحت دی۔

''تمہارا اسطرح رات کے وقت بنا کسی احتیاط کے باہر پھرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، گو کہ۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

''کہ؟''

''کچھ نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں گھر جانا چاہیے'' بات بدلی۔

''چلا جاؤں گا'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ نوید نے گردن موڑ کے غور سے اُسے دیکھا، کوئی شے تو تھی، جو اُسے تنگ کر رہی تھی۔

''کس طرح جاؤ گے؟ پیدل؟''

''ہاں''

''میں چھوڑ دیتا ہوں''

''میں نے کہا ہے ناں۔۔۔ میں چلا جاؤں گا خود ہی۔۔''

''تو پھر جاؤ ابھی، یہ بھی کوئی وقت ہے اس قسم کے نظارے کرنے کا'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے خفگی سے سمندر کی جانب اشارہ کیا تو وہ اُسکے انداز پر مسکرا دیا، اس پاگل کو آج بھی تسلی دینی نہیں آئی تھی۔

''تمہاری جان کو خطرہ ہے، احتیاط کرنی چاہیے تمہیں، میں چھوڑ دیتا ہوں ناں!'' اُسے مسکراتا دیکھ، نوید کو اُسکی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا، اسی لیے دوبارہ پوچھا۔

''میری جان کی فکر کیوں کر رہے ہو؟ کیا میں وہ نہیں ہوں، جس نے تمہاری کردار کشی کی تھی؟'' بڑا غیر متوقع سوال تھا۔ یکدم ہی اُسکے ماتھے پر بل پڑے اور چہرے پر دوبارہ سختی در آئی۔ علی جانچتی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ آنکھوں میں سختی لیے کھڑا ہو گیا۔

''تم جانتے ہو تم سب کے پیچھے اس وقت سی ٹی ڈی کے کتنے جوان گھوم رہے ہیں؟'' جیبوں میں ہاتھ ڈالے چہرے پر اجنبیت طاری کیے اُس نے سوال کیا۔ علی ناسمجھی سے اُسے دیکھتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''تم، اور تمہارے ساتھ باقی تمام لوگوں کے پیچھے کم از کم بھی سی ٹی ڈی کے تین تین جوان، عام لباس میں گھوم رہے ہیں۔ جنہیں تم پہچان بھی نہیں سکتے۔ صرف اس لیے کہ تم سب کی حفاظت کو یقینی بنایا جاسکے۔ تمہاری ایک غلطی علی۔۔۔ صرف ایک غلطی، کئی زندگیاں برباد کرسکتی ہیں۔'' اس وقت وہ اُس سے چند قدم دور ہونے کے باوجود کئی گنا فاصلے پر نظر آرہا تھا۔ شناسائی، پرانے تعلق کی ایک جھلک، سب پل میں ہی چہرے سے غائب ہو چکے تھے۔ اب وہ صرف ایک سی ٹی ڈی آفیسر تھا، جو علی کی لاپرواہی کو ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری فکر کرنا میرا ذاتی مفاد نہیں ہے، بلکہ اس ملک کے ہر شہری کی حفاظت کرنا میرے فرائض میں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ایسی لاپرواہی دوبارہ نہ کرو'' اُسے تنبیہہ کرکے نوید نے دوبارہ اُسے ساتھ چلنے کی پیشکش نہ کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا جاکر گاڑی میں بیٹھا، اور یہ جا وہ جا۔۔۔

علی نے گہری سانس لی اور جانے کیلئے پلٹ گیا۔

دیوار بے شک گرگئی تھی، لیکن ان دونوں کے درمیان آیا خلا بہت گہرا تھا۔

بہت زیادہ۔۔۔

-------+--------+--------

علی سے ہونے والی گفتگو نے پہلے ہی اُسکا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا، جو بات وہ نہیں کرنا چاہتا تھا وہی بات نکالے بیٹھ گیا تھا۔ اُس پر سے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک نئی پریشانی اُسکی منتظر تھی۔

اُسکے ملازمین چہرے پر مسکینیت طاری کیے اُسکے سامنے کھڑے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' اُس نے حیرت سے اُن سب کو قطار میں کھڑے دیکھا۔

''صاحب وہ۔۔۔'' گارڈ نے تھوک نگلا، اُسکے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کے دماغ نے سارا حساب کتاب کرکے نتیجہ برآمد کرلی۔

''بشریٰ۔۔۔'' غصّے کا اُبال اُسکے اندر اٹھا تھا۔ وہ الٹے قدموں باہر کی جانب بھاگا تھا۔

''صاحب میں ساتھ آؤں؟'' گارڈ نے تیزی سے اُسکے پیچھے آتے ہوئے پوچھا

''شٹ اپ۔۔۔ تم سے میں اُسکا حساب آکر لوں گا'' اُسے دھمکی دیتا، وہ گاڑی لے اُڑا تھا۔

اس گھر کے ملازمین کو اُس نے کبھی یہ پتہ نہیں چلنے دیا تھا کہ بشریٰ رات کو قبرستان چلی جاتی ہے۔ اُسکے ہزار دشمن تھے، کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ گو کہ ملازمین کی پوری جانچ پڑتال کرکے گورنمنٹ اُسکے حوالے کرتی تھی، لیکن پیسوں کی لالچ کسی کو بھی ایمان بیچنے پر مجبور کرسکتی تھی۔

جب پہلی بار بشریٰ گھر سے غائب ہو کر قبرستان آ کر بیٹھی تھی، تب وہ حقیقتاً پریشان ہوا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں جب اُسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف قبرستان ہی جاتی ہے، تو اس نے اُسے جانے دیا۔ وہ اُسکے پیچھے گھر سے نکلتی تو ملازمین کو یہی لگتا کہ صاحب کی بیگم کسی کام سے جا رہی ہیں۔ گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارتے اور دیگر کام کاج کرتے جب وہ باہر جاتی تو ملازمین کو یہ اندازہ نہ ہوتا کہ وہ کہاں جا رہی ہو گی۔ لہٰذا ملازمین کو اُس کی آمد و رفت پر نظر رکھنے کیلئے کہنے سے بہتر تھا کہ نوید اُسے قبروں پر جانے دیتا، اور واپسی اُسے خود لیکر آتا۔ ایسا ہر روز نہیں ہوتا تھا، لیکن جب بھی ہوتا ملازمین یہی سمجھتے کہ وہ کسی کام سے باہر گئی ہے۔

البتہ مائیکل والے واقعے کے بعد سے وہ محتاط ہو گیا تھا۔ اُس نے پہلی بار ملازمین کو کہا کہ گھر سے کسی کو جانے نہ دے، یہ میرا حکم ہے۔ لیکن پہلی بار میں ہی ٹھیک ٹھاک نااہلی کا مظاہرہ ہوا تھا۔

قبرستان پہنچ کے وہ اپنے بچوں کی قبروں کے پاس آیا تو بشریٰ وہاں نہیں تھی، آس پاس دیکھا۔ اندھیرا بہت زیادہ تھا۔

''بشریٰ! میں جانتا ہوں تم یہیں ہو۔'' قبرستان کی خاموشی میں اُسکی بھاری آواز گونجی تھی۔

''ٹھیک ہے، اگر تم نہیں آؤ گی تو میں بھی یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا'' اُس نے آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ جیسے یقین ہو کہ وہ وہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔

''اور جب ہم دونوں ہی گھر نہیں جائینگے، تو ہمارے بچے رو رو کر خود کو ہلکان کر لیں گے۔ اچھا لگے گا تمہیں یہ؟'' اُس نے ہمیشہ کا آزمودہ حربہ استعمال کیا۔

''تم ہمیشہ یہی کرتے ہو۔'' اپنے پیچھے سے آتی آواز پر وہ جھٹکے سے پلٹا۔ وہ ایک اونچے درخت کے پیچھے سے برآمد ہوئی۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ نوید نے سکھ کا سانس لیتا اُسکے پاس آیا۔

''کیوں کرتی ہو تم ایسا؟ کیوں پریشان کرتی ہو مجھے؟ منع بھی کیا تھا تمہیں کہ میرے بنا گھر سے باہر مت نکلنا'' وہ جیسے تھک گیا تھا۔

''میں کیا کروں؟ میرے بچے مجھے بلاتے ہیں'' وہ بے بسی سے بولی تھی۔

''گھر چلو۔'' اُس نے اسکے دونوں ہاتھ تھامے۔

''نہیں۔۔ آج میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں رہوں گی۔ بس!'' وہ نفی میں سر ہلاتی رونے لگی تھی۔

''چلو۔'' اُس نے نظرانداز کرتے ہوئے اُسے ساتھ گھسیٹا۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ چیخ اُٹھی تو نوید کے قدم تھمے۔

''کہیں نہیں جاؤں گی میں'' وہ اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہوتی اُسکے بازو پر تھپڑ مارتی چیخ رہی تھی۔ آج پورے چھ ماہ بعد اُس نے وہی ردعمل دیا تھا۔

''بشریٰ! کیا ہو گیا ہے؟ ہم گھر نہیں جائیں گے تو کہاں جائیں گے؟'' اُس نے تحمل سے سمجھانا چاہا۔

''نہیں! میں نہیں جاؤں گی۔۔۔ میرے بچے۔۔اکیلے۔۔۔'' وہ ہچکیوں سے روتی چیخ رہی تھی۔

''بشریٰ! ہوش کرو'' نوید نے اُسے جھنجھوڑ دیا۔ وہ تھک کر نیچے بیٹھتی چلی گئی، وہ بھی اُسکے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔

''بشریٰ۔۔۔بشریٰ۔۔'' اُسکے گال تھپتھپاتے ہوئے پریشانی سے چلایا تھا، لیکن وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

اُسے بازوں میں اٹھاتے، گاڑی میں ڈال کر گھر لاتے اور بیڈ روم تک لیجاتے، وہ اشتعال انگیز انداز میں ملازمین کو ڈاکٹر بلانے کیلئے کہہ رہا تھا۔ گھر کے تمام ملازمین خوف سے کانپ رہے تھے۔اُنہوں نے یقیناً بڑی غلطی کی تھی۔

اُسے دورہ پڑا تھا، ڈاکٹر نے فوراً اُسے Haloperidol اور Promethazine کا انجکشن دیا تاکہ دماغ کو وقتی طور پر پرسکون کیا جاسکے۔اُسے ضروری احتیاط کی ہدایت دیتا ڈاکٹر اب واپس جا چکا تھا۔اُسے سکون سے سوتا چھوڑ کر نوید نے پہلے اپنے بچوں کے کمرے میں جھانکا، دونوں کمبل میں لپٹے سو رہے تھے۔ جانے سے پہلے وہ یہ اطمینان کر کے گئی تھی کہ دونوں بچے سو رہے ہوں۔ ریلنگ سے نیچے جھانکا تو گراؤنڈ فلور کے لاؤنج میں سارے ملازمین قطار میں کھڑے تھے۔ غصّہ ایک بار پھر عود آیا۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، چہرے پر سختی لیے وہ نیچے اترتا، اُنکے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اس نااہلی کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟'' سنجیدگی سے پوچھا۔

''صاحب! میں بس تھوڑی دیر کے لیے۔۔۔''

''وہ گھر سے باہر گئی تو مجھے فون کیوں نہ کیا؟ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ کچھ بھی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دو؟'' ملازم کی بات کاٹتے اُس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''میں نے جان بوجھ کر۔۔۔''

''کہا تھا یا نہیں؟'' وہ دھاڑا تھا۔

''ک۔۔ کہا تھا'' اُنکے کے چہرے خوف سے سفید ہو رہے تھے۔

''تو پھر یہ غلطی کیسے ہوئی؟'' آنکھوں میں غیظ و غضب لیے وہ اُنکے اوسان خطا کر رہا تھا۔ سب سہمے کھڑے تھے۔

''صاحب! میں نے سوچا تھا کہ۔۔ کہ آپکے آنے سے پہلے تک انکو ڈھونڈ کر لے آؤنگا۔ میں قبرستان۔۔۔'' ملازم کوئی وضاحت دینے ہی لگا تھا کہ نوید نے اپنی جگہ سے ہلے بنا اُسکا گریبان پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے اپنے قریب کیا۔

''جب میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ مجھے فوراً اطلاع دو، تو تم کون ہوتے ہو اپنی سوچ استعمال کرنے والے؟ ہاں؟'' اُسکا چہرہ جبڑے سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''میرے آتے تک اگر کچھ ہو جاتا تو؟ بولو؟''

''معاف کر دیں صاحب! غلطی ہو گئی'' وہ منمنایا۔

''اُسکا حساب کل تم سب ڈیپارٹمنٹ کو دو گے، مجھے ایسے نااہل ملازم نہیں چاہیے۔''اُسے چھوڑتے ہوئے سرد لہجے میں کہااور ان سب کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے وہاں سے چلے گئے تو وہ تھک کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتا، سر پیچھے کیے کنپٹی مسلنے لگا۔

''اسے کیسے پتہ کہ بشریٰ قبرستان جاتی ہے؟''اچانک ہی یاد آیا تو سیدھا ہو بیٹھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ ان میں سے کوئی بھی ملازم نہیں رکھنے والا تھا۔

-------+--------+--------

وہ گھر آیا تو احمد جاگ رہا تھا اور سفیر صاحب لاؤنج میں پریشانی سے ٹہل رہے تھے۔ وہ اُسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر تیزی سے اُسکے پاس آئے۔

''تم ٹھیک ہو علی؟''

''تم کیوں جاگ رہے ہو اب تک؟''اُس نے اُنہیں نظرانداز کر کے احمد سے پوچھا۔ وہ ڈر کے کھڑا ہوا۔ وہ ویسے بھی علی سے خائف ہی رہتا تھا۔

''بچہ پریشان ہو گیا تھا''

''میں نے پوچھا کہ سوئے کیوں نہیں اب تک؟''اُسے بازو سے پکڑ کر سفیر صاحب، فاطمہ، نوید اور دنیا جہاں کا غصّہ اُسی پر اتارا تھا۔

''سوری بابا!''اُس نے آنسوؤں سے نم آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہمیشہ کا کہا ہوا جملہ دھرایا۔

''رونا مت۔۔۔ بلکل نہیں پسند مجھے لڑکوں کا رونا''اُس نے مزید ڈانٹا تو احمد نے سر جھکا لیا کہ اُسکے آنسو اُسکے باپ کو نظر نہ آئیں۔

''مت ڈانٹو اُسے علی! بچہ ہے وہ''سفیر صاحب نے دکھ سے کہا تو اس نے ایک شکوہ کنا نظر اپنے باپ پر ڈالی۔

''فوراً جا کر سو، بے شک کل اتوار ہے لیکن تم ہر حال میں صبح آٹھ بجے اٹھو گے۔''اُس نے سختی سے کہا تو وہ جلدی سے اندر بھاگا۔ علی اپنے باپ کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ پچھلے چار سال سے اُسکا اپنے بیٹے سے یہی رویہ تھا۔ سفیر صاحب تھک کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

اُنکے پاس پچھتانے کے لیے بہت کچھ تھا، لیکن سب سے زیادہ دکھ اُنہیں اس بات کا تھا کہ علی کے اندر اُنہیں اب اپنا آپ نظر آنے لگا تھا۔

-------+--------+--------

اور وہ سامنے کھڑی تھی، رضا نے اُسے ایسے ہی آنے کو کہہ دیا تھا، پر وہ واقعی آچکی تھی۔

''تم نے کہا تھا کہ بچوں سے مل لوں، تو اسی لیے آگئی''اُسے حیرت سے خود کو دیکھتا پا کر خجالت سے بولی۔

''تمہارا بہت شکریہ کہ تم آئی، آنٹی کیسی ہیں؟''

''الحمدُاللہ ! طبیعت کافی بہتر ہیں اب۔ ابھی ہماری پھوپھو کی طرف گئی ہیں،اُن سے ملنے''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ تم بیٹھو ! میں تمہیں بچوں سے ملواتا ہوں۔'' پتہ نہیں وہ اتنا خوش کیوں تھا؟ جزا کے آنے کی خوشی تھی یا اس بات کی کہ وہ اُسکی بات مان کر آگئی تھی۔ وہ اُسے وہاں چھوڑ کے اندر کی جانب کسی کمرے میں چلا گیا، وہ چہرہ گھما کر یہاں وہاں دیکھنے لگی، اچانک ہی اپنے بازو پر سرسراہٹ کا احساس ہوا، چہرہ گھما کے دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ مطمئن ہو کر دوبارہ اپنے مشغلے میں مصروف ہو گئی۔ سرسراہٹ دوبارہ ہوئی تو اب کہ رخ پھیر کر دیکھا۔ اب بھی کوئی نہیں تھا، وہ پریشان ہوئی۔ اگلے ہی لمحے ایک ننھا سا ہاتھ برآمد ہوا اور صوفے کے ہاتھ پر کچھ تلاشنے کے سے انداز میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ اُس نے ذرا سا سر آگے کر کے نیچے جھانکا تو پہلے رنگین کلپوں والا سر، اور پھر گول گول آنکھوں سے اُسے دیکھتا معصوم سا چہرہ نمودار ہوا۔ جو صوفے کے پیچھے سے چھپ کر اُسے چھیڑ رہا تھا۔

''اوہ۔۔ تو یہ آپ تھیں ؟'' اُس نے بچی کی ناک دبائی، وہ شرما کے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپانے لگی تو اُسے، اُس پر ٹوٹ کے پیار آیا۔ اُس نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' وہ سال ڈیڑھ سال کی بچی، اُسکی گود میں آنے کے بعد بھی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئی تھی۔

''آ۔۔۔ کیوٹو'' جزا نے اُسے قریب کر کے اُسکے ماتھے سے اپنا ماتھا ٹکرایا۔ اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیکر کمرے میں داخل ہوتا رضا، اُن دونوں کو دیکھ کر تھما تھا۔ مومنہ کے ساتھ کھیلتی جزا، منظر سے غائب ہو رہی تھی۔ اُسکی جگہ رضا کی ماں نے لے لی تھی، مومنہ کی جگہ رضا آگیا تھا۔ وہ سانولے چہرے اور پرکشش نقوش والی اُسکی ماں، اُسے پیار کر رہی تھی۔

''بھئی ! یہ تو بہت شرمیلی ہے۔'' جزا نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ ہوش میں واپس آیا۔

''کوئی نہیں ! بہت شرارتی ہے۔ بس ابھی ایسے ہی ڈرامے بازیاں کر رہی ہے'' مومنہ اُسکی گود سے اُتر کر رضا کے پاس آگئی تھی۔ رضا نے ایک سال سے لیکر چار سال تک کے پانچ چھّ بچے جزا کے سامنے لا کھڑے کیے۔

''بچوں ! ان سے ملو، یہ ہماری پڑوسن ہیں۔'' اُس نے تعارف کروایا۔ بچے دلچسپی سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''ہیلو !'' جزا نے انکو دیکھ کر ہاتھ ہلایا، تو بچے ہنسنے لگے۔ واکر میں بیٹھا بچہ اُسے دیکھ کر پتہ نہیں کیوں ہمکنے لگا۔ اُس نے اُسے گود میں لے لیا۔ اب وہ اُسکے کانوں میں لٹکتے بندے چھیڑ رہا تھا۔

''اسکا نام محمد ہے، یہ مومنہ ہے، یہ مناہل اور اسکا نام ولید ہے۔ یہ والا۔۔۔'' وہ ایک ایک بچے کا تعارف کروا رہا تھا۔ جزا باری باری سب سے مل رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اور بچے آجاتے اور اُس سے مل کر جاتے۔ رضا ساتھ ساتھ اُنکا تعارف بھی دے دیتا۔

''ماشاءاللہ ! بہت سمجھدار بچے ہیں۔'' اُس نے تعریف کی تو وہ مسکرایا۔ عائشہ جی دونوں کے لیے چائے اور ناشتے کے لوازمات لے آئیں۔

''زحمت کی آپ نے''

''ارے زحمت کیسی؟'' وہ وہیں بیٹھ گئیں۔

''ان بچوں کے بارے میں کچھ بتاؤ'' جزا نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے جاننا چاہا۔

''مختلف حالات ہیں سب کے۔۔۔سب کی تفصیل میں تو ابھی نہیں جاسکتا، لیکن کچھ کے بارے میں بتادیتاہوں۔ یہ محمد ہے، اِسے اِسکے ماں باپ ابھی کچھ دن پہلے ہی یہاں چھوڑ کے گئے ہیں''

''سگے ماں باپ؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! سگے ماں باپ۔۔۔اسکوڈاؤن سنڈروم ہے۔ اسکے ماں باپ بیمار بچے کو نہیں پالنا چاہتے تھے، اسی لیے یہاں چھوڑ گئے۔ میری ایک اسکول ٹیچر کے کزن تھے، اُنھوں نے ہی بچے کو یہاں لانے کا کہا۔'' جزا کو اپنے دل میں تکلیف محسوس ہوئی۔ کوئی ماں باپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟

''مومنہ کا باپ مر گیا تھا، ماں دوسری شادی کر کے باہر ملک چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے اسے میرے حوالے کر گئی۔ ویڈیو کال کر کے بات کرتی رہتی ہیں۔ وہ بچہ عبدالرافع، جس کی تم شکایت لیکر آئی تھی۔ اُسکے ماں باپ نے ساری زندگی سڑکوں پر ہی گزاردی تھی۔ ایک رات اسی طرح وہ سڑک کنارے سوئے ہوئے تھے، جب ان پر ایک ٹرالر چڑھ کر چلا گیا۔ بچہ حادثے میں محفوظ رہا تھا۔ اُسے میں یہاں لے آیا'' وہ ایک ایک کر کے سب کی تفصیل دے رہا تھا۔

''اور وہ؟ وہ کون ہے؟'' اُس نے دروازے کے پیچھے چھپی ایک بچی کی جانب اشارہ کیا۔ رضا نے تعاقب میں دیکھا تو اُسکی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''وہ۔۔وہ ارمینہ ہے'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''شرمیلی ہے ذرا۔۔'' عائشہ جی نے کہا۔ ارمینہ سب کی نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر وہاں سے بھاگ گئی۔ رضا کی نظروں نے دور تک اُسکا پیچھا کیا تھا۔

''تم ان بچوں کے لیے کسی ادارے کی مدد لیتے ہو یا کوئی فنڈز وغیرہ'' جزا نے ذرا سنبھل کر سوال کیا تھا، پر عائشہ جی نے دہل کر اُسے دیکھا۔ کیونکہ یہ وہ سوال تھا جو رضا کو بھڑکا دیتا تھا، اُسے احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط بول گئی ہے، لیکن وہ ہنس دیا۔

''یہ میرے بچے ہیں جزا! یہ اپنے حصے کا رزق کھاتے ہیں، یہ گھر انکا ہے۔ نہ یہ یتیم خانہ ہے نہ ہی خیراتی ادارہ۔۔'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کے جواب دیا۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار تھی، بھلا اتنے سارے بچوں کی ضروریات، خواہشات اور اخراجات بنا کسی فنڈز کے کیسے پورے ہو رہے تھے؟ لیکن مزید سوال نہ کیا۔

''تمہاری امی کیسی ہیں؟'' عائشہ جی نے پوچھا تو وہ اُنکی جانب متوجہ ہو گئی۔ لیکن ذہن وہیں بھٹک رہا تھا۔

کائی رنگ کے ٹراؤزر پر ہم رنگ زپر سویٹر پہنے رضا، اُسکے تاثرات سے محظوظ ہوتا چائے پی رہا تھا۔ زندگی یکدم ہی پر سکون لگنے لگی تھی۔ وہ اُسکے بلانے پر آئی تھی، بچوں سے ملی تھی۔ اُس نے رضا کی بات مان لی تھی۔

جاتے وقت کچھ چھوٹے بچے بھی رضا کے ساتھ اُسے دروازے تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اُسکے ساتھ بہت خوش نظر آرہے تھے۔

''اب مجھے بتاؤ گے کہ تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟'' دروازے پر کھڑی جزا کے سوال نے اُسے حیران کر دیا۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنے جلدی جان جائے گی۔

''حیران مت ہو! ہر کام کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ مجھے وہ وجہ جاننی ہے بس'' براؤن اور بلیک امتزاج کے سوٹ میں، دروازے سے منسلک کیاری کے پاس کھڑی، اس وقت وہ بھی منظر کا حصہ لگ رہی تھی۔ سانولی رنگت سرما کی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ رضا نے گہرا سانس لیا۔

''میں تمہیں بطور بچوں کی استاد ہائر کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس نے مدّعا بیان کیا۔

''کیا مطلب؟''

''دیکھو! ان بچوں کو پڑھانے اور گھر میں انکی اخلاقی تربیت کرنے لیے ایک ٹیچر آیا کرتی تھیں، بچے بھی کافی اٹیچ تھے اُنکے ساتھ، لیکن پھر وہ اسلام آباد منتقل ہو گئیں تو دوبارہ کسی کو ہائر نہیں کر سکا، کیونکہ بچے کافی اُداس تھے اور کسی سے گھل مل بھی نہیں رہے تھے۔ اور دیگر ٹیچرز بھی بس پیسوں کے لیے ہی آنے کو تیار تھے۔ مجھے ایسا استاد چاہیے جو انہیں اپنا بچہ سمجھ کر اُنکی تربیت کرے، اُس دن اسکول کی میٹنگ میں اور آج بچوں کے ساتھ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارے اندر وہ قابلیت اور صلاحیت ہے۔ اگر تم روز شام میں چند گھنٹے ان بچوں کو دے دو، تو انکے لیے اچھا ہوگا۔ اینڈ آئی ول پے فار دیٹ (اور میں اسکا معاوضہ دونگا)'' اُس نے تفصیلاً مدعا بیان کیا۔ اس دوران جزا کی نظریں گھاس کی طرف تھیں، اُسکا دماغ سارے حساب کتاب کر رہا تھا۔ نوکری کی ضرورت تو اُسے ویسے بھی تھی، صرف اسکول کی تنخواہ سے گزرا نہیں ہوتا تھا اور مجبوراً بھائیوں سے خرچ لینا پڑتا تھا۔ اگر وہ یہ نوکری کر لے تو اُسی کا فائدہ ہے۔ اور برابر میں ہی گھر ہونے کی وجہ سے امی کی طرف سے پریشانی بھی نہیں رہے گی نہ بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑیگا۔

''تو پھر میں کیا سمجھوں؟'' اُسے خاموش دیکھ کر رضا نے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ ستواں ناک میں سجی لونگ شام کی جاتی دھوپ میں چمکی تھی۔

''ٹھیک ہے! میں کل سے آجاؤں گی۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو اُس کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

''تمہارا بہت شکریہ''

''شکریہ اُن کو کہتے ہیں جو احسان کریں، اور بچے احسان کے نہیں، پیار کے مستحق ہیں'' اُسی کے انداز میں، اُسی کا جواب اُسی کو لٹاتی، وہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ رضا حیران سا، اُسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

-------+--------+--------

''یہ دیکھیں! میرے بیٹے کو پولیو ویکسین ابھی چند دن قبل ہی لگی ہے، لہٰذا اسے قطروں کے ضرورت نہیں ہے'' مقدّم نے میڈیکل ریکارڈ دروازے پر کھڑی پولیو ورکر کے سامنے کیا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔'' وہ سر ہلاتی ہوئی اپنے رجسٹر میں کچھ لکھنے لگی۔

''معذرت سر کہ آپکو زحمت ہوئی، لیکن کیا کریں؟ یہ ہماری ڈیوٹی ہے'' خاتون نے پیشہ وارانہ طریقے سے کہا۔

''کوئی بات نہیں!'' اُس نے معذرت قبول کرتے ہوئے دروازہ بند کیا تھا۔ گلی گلی پولیو مہم چل رہی تھی، اور وہ مکرم کو پہلے ہی ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے ویکسین لگوا چکا تھا۔ لیکن اُنکے پاس رکارڈ موجود نہیں تھا۔ صبح سے اب تک وہ دو مرتبہ انکے ساتھ سر کھپا چکا تھا لیکن وہ بار بار آ جاتے، اور یہی کہتے کہ ہم تک ریکارڈ نہیں پہنچا۔ پھر جب وہ میڈیکل ریکارڈ دکھاتا تو معذرت کرتے ہوئے چلے جاتے۔ ابھی بھی یہی ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹا، باغ کراس کر کے وہ گھر کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ مرکزی دروازہ پھر سے بج اٹھا۔

''اب کون ہے؟'' وہ جھنجھلاتا ہوا دوبارہ دروازے تک آیا۔

''السلام علیکم! میں۔۔۔'' دروازہ کھولا تو سامنے نیلے رنگ کے عبایا میں سکارف لپیٹی ایک لڑکی کھڑی تھی، کندھے پر بیگ ٹانگ رکھا تھا۔ اُسے دیکھ کر مقدّم کا دماغ گھما تھا۔

''مس کمیونیکیشن اور مس مینجمنٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔'' اُسکی بات پوری ہونے سے قبل ہی وہ بولا۔ نووارد حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

''آپکی ٹیم لیڈ اور ورکرز کو صبح سے دو مرتبہ میں بتا چکا ہوں کہ میں اپنے بچے کو پولیو ویکسین لگوا چکا ہوں۔ آپکی ٹیم لیڈ، رجسٹرڈ بھی کر چکی ہیں لیکن پھر بھی۔۔'' وہ سخت تپا ہوا تھا۔

''میں سمجھی نہیں'' لڑکی نے ناسمجھتے ہوئے پوچھا۔

''اب یہ آپ کو آپ کی ٹیم لیڈ سمجھائیں گی۔ کم از کم اُنہیں پوری ٹیم کو مطلع کرنا چاہیے کہ اس گھر کے بچے کو پولیو دیا جا چکا ہے۔ نہیں تو دیوار پر لکھا ہوا نمبر ہی پڑھ لیں، لیکن نہیں! اپنی عقلیں استعمال ہی نہیں کرنی'' رکھائی سے کہتا وہ دروازہ بند کر چکا تھا۔ اگلا ہی لمحے پھر بیل بجی اور اس زور سے کے اُس کو دروازہ کھولنا ہی پڑا۔

''کیا مسئلہ۔۔۔'' سامنے کھڑی اُسی لڑکی کو دیکھ کر وہ کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ اس بار لڑکی نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے چڑھائی کر دی۔

''انسان کے اندر اتنی تمیز اور اتنے اخلاقیات تو ہونی چاہیے کہ پہلے وہ آنے والے کا تعارف لے، نہ کہ اپنی قیاس آرائیاں شروع کر دے۔ اس بدتمیزی کا حساب آپ سے بعد میں لوں گی، ابھی مجھے میرے بھانجے سے ملوایئے'' اگلی نے بھی حساب بے باک کیا۔

''کیا مطلب؟'' اُس نے ناسمجھی سے دیکھا اور اگلے لمحے اُسکے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''شیریں کی بہن۔۔ مکرم کی خالہ۔۔'' اُسکی یاداشت نے کام کرنا شروع کیا۔

''اوہ۔۔۔آپ۔۔۔آپ مقدّس ہیں۔آئی ایم ریئلی سوری۔۔میں۔۔۔''اُسے سمجھ نہیں آیا کہ اپنی بدتمیزی کی وضاحت کیسے دے؟

''جی!آگئی آپ کی یاداشت واپس؟''مقدّس نے گھورتے ہوئے پوچھاتو وہ مزید شرمندہ ہوا۔پتہ نہیں اتنا چڑچڑا کب سے ہو گیا تھا؟

''آپ اندر آیئے۔''ایک طرف ہوتے اُسے راستہ دیا۔وہ چہرے پر خفگی لیے اندر آگئی۔مقدّم نے خود کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے، دروازہ بند کیا۔آخری بار جب اُسے دیکھا تھاتو سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔دو چٹیاں باندھ کر ہر وقت آنکھوں پر چشمہ لگائے،پڑھائی میں مصروف رہتی تھی۔

''کہاں ہے مکرم؟''اندر داخل ہوتے ہی پوچھا،اُسکے جواب دینے سے پہلے ہی نظریں صوفے پر بیٹھے مکرم تک گئی۔آنکھیں لبریز ہوئیں، دل محبت سے بھر گیا،آگے بڑھ کر اُسے سینے میں بھینچ لیا۔خلاف توقع وہ رویا نہیں بلکہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

''میرا گڈا۔۔کتنا پیارا ہے یہ''اُسے چٹاچٹ چومتے ہوئے بولی۔مقدّم کے دل کو کچھ ہوا، بھلا باہر سے آکر نہ ہاتھ دھوئے نہ sanitizer کا استعمال کیا۔ایسے ہی اُس کے بچے کو پیار کرنا شروع کر دیا۔دل تو کر رہا تھا کہ مکرم کو اُسکی گود سے چھین لے، لیکن تھوڑی دیر قبل جو بدتمیزی وہ کر چکا تھا،اُسکے بعد خود کو قابو میں رکھنا ہی مناسب سمجھا۔اب دل پے پتھر رکھے اُسے صوفے پر بیٹھے مکرم کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ رہا تھا۔

''ایسے نظرانداز کر رہی ہے، جیسے میں یہاں ہوں ہی نہیں''اُسے مسلسل مکرم سے باتیں کرتا دیکھ،اُس نے کوفت سے سوچا۔اپنے ہی گھر میں ایسا سلوک ناقابل برداشت تھا۔ملازم چائے رکھ کر چلا گیا۔

''آپ کا بہت شکریہ کہ اتنے عرصے اسکا اتنا خیال رکھا''بلکل اچانک ہی اُس نے مقدّم کو مخاطب کیا۔چہرے پر چھائی خفگی غائب ہو چکی تھی۔اُس کے دماغ نے ریڈ سگنل دیا تھا۔

''کیا مطلب شکریہ؟مکرم میرا بیٹا ہے اور آگے بھی میں ہی اُسکا خیال رکھوں گا۔''چبا چبا کے جواب دیا۔اخلاق پر شدید غصّہ آیا، جس نے اِس لڑکی کو یہاں بھیجا تھا۔

''ہاں!لیکن ہمارا بھی تو خونی رشتے ہے نہ اور اب سے میں بھی۔۔۔''وہ اپنی دھن میں کہہ رہی تھی۔

''اُسکے خونی رشتے اتنے سال سے کہاں تھے؟جواب حق جتانے آگئے ہیں۔میری بات ذہن نشین کر لو مقدّس!میں اپنے بیٹے کو یہاں سے لے جانے کی اجازت کسی کو نہیں دوں گا''سختی سے کہا۔

''کیا تمہیں ایسے ہی قیاس آرائیاں کرنے کا شوق ہے؟''پھر سے خفا ہوئی۔

''میں یہاں صرف اور صرف اپنے بھانجے سے ملنے آئی ہوں۔اُسکے ساتھ اچھا وقت گزارنا چاہتی ہوں۔یہ میری بہن کی نشانی ہے۔اور تم بھول گئے؟قانونی طور پر مکرم تمہاری کسٹڈی میں ہے۔کوئی بھلا کیسے اسے تم سے چھین سکتا ہے؟''اُس نے خفگی سے کہا تو وہ خاموش ہوا۔البتہ یقین ابھی بھی نہ آیا تھا۔چہرے سے واضح تھا کہ اُسکے یہاں آنے سے ناخوش ہے۔

''دیکھو! میں بھی اپنی قبائیلی رسم ورواج کے آگے اتنا ہی مجبور تھی، جتنا کوئی بھی لڑکی ہو سکتی ہے۔ لیکن اب حالات بدلنے لگے ہیں۔ میری نانی اور ماموں نے میری حمایت کی ہے، جسکی وجہ سے مجھے شہر میں نوکری کرنے کی اجازت ملی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے میرے بھانجے کا خیال نہ تھا، بس میں بھی روایتوں اور رسموں میں جکڑی ہوئی تھی'' اُس نے اُداسی سے کہا تو مقدّم شرمندہ ہوا۔ پتہ نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا اور کیوں؟

''میرے پاس تم سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کراچی آنے سے پہلے اخلاق بھائی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے تمہارا ایڈریس دیا۔ یہ ملاقات بھی خفیہ تھی کیوں کہ تم جانتے ہو خاندان میں اخلاق بھائی سے ملنا کتنا بڑا جرم سمجھ جاتا ہے۔'' وہ مزید شرمندہ ہوا۔ خواہ مخواہ ہر بندے پر شک کرنے لگا تھا۔

''آئی ایم سوری! میں بس ذرا شبہات کا شکار تھا'' وضاحت دی گئی، جو فوراً قبول کر لی گئی۔

''نہ نہ۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔'' مُسکراتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی۔ مکرم تو اُسکی گود سے ایسا چپکا تھا جیسے مقدّم کو جانتا ہی نہ ہو۔

''معلوم ہے؟ میری ہاؤس جاب مکمل ہونے کے بعد ابّا نے تو مجھے گھر ہی بیٹھا دیا تھا۔ وہ تو نانی اور ماموں نے میری لیے اسٹینڈ لیا کہ ڈاکٹر بنا کے بھی گھر ہی بٹھانا ہے تو کیا فائدہ؟ خیر بڑی مشکلوں سے مانے وہ، آج کل نانی کے گھر پر ہی رہ رہی ہوں۔ ماموں بیچارے طلاق یافتہ ہیں تو آج کل، میں اور نانی اُنکے لیے رشتہ تلاش رہی ہیں'' اُسے قطعاً یہ جاننے میں دلچسپی نہ تھی کہ اُسکے ماموں طلاق یافتہ ہیں یا رنڈوے، وہ بس یہ چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد مکرم سے ملاقات ختم کرے اور یہاں سے چلتی بنے۔ لیکن مقابل بھی فرصت سے بیٹھی تھی۔

''آپ کیا کرتے ہیں ویسے؟'' مقدّم کی صفر دلچسپی دیکھ کر اُسے بھی گفتگو میں شامل کرنا چاہا۔

''اخلاق نے بتایا نہیں؟'' اتنا بد اخلاق تو وہ کبھی نہ رہا تھا۔

''ہاں! بتایا تھا کہ آپ والد صاحب کی اوڈیٹر زاینڈ لیگل ایڈوائزر فرم کو کافی وسیع کر چکے ہیں اور بہت محنت کر رہے ہیں۔ کام کے ساتھ مکرم کی دیکھ بھال مشکل ہوتی جارہی ہے اسی لیے آپکو کیئر گیور کی اشد ضرورت ہے۔ تو میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔ اور وہ بھی مفت۔۔۔'' کتنے آرام سے وہ اُسے گھما پھرا کر اپنے مطلب کی بات پر لائی تھی۔

''اور میں مکرم کی ذمے داری تمہیں کیوں دوں؟'' دانت کچکچا کر سوال کیا۔ یہ لڑکی اسکا وقت ضائع کر رہی تھی۔

''کیونکہ میں اسکی خالہ ہوں''

''یہ کوئی جواز نہیں ہے''

''مقدّم!۔۔۔'' اُس نے جیسے ہار مانتے ہوئے مکرم کو گود سے اتار کے برابر میں بٹھایا۔

''میں جانتی ہوں کہ میرے والدین کے رویّے کو لیکر تمہارے دل میں بہت خدشات ہیں۔ لیکن یقین جانو کہ اس سب میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ جب تم دو سال پہلے مکرم کو لینے آئے تھے، اگر میں اُس وقت وہاں ہوتی تو آخری وقت تک اسکے لیے لڑتی۔ لیکن میں ہاؤس

جاب کے لیے دوسرے شہر میں تھی۔ان سب سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔میں اپنی بہن کی نشانی کو گلے سے لگانے کے لیے کتنا تڑپی ہوں، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''پہلی بار اُسکی باتوں میں اُسے صداقت محسوس ہوئی۔لیکن وہ خاموش رہا۔

''اور اگر تمہیں یہ خوف ہے کہ، میں تمہاری غیر موجودگی میں اسے اپنے ماں باپ کے پاس لے جاؤں گی۔تو مجھ سے حلف لے لو۔۔۔ میرے ماں باپ آج بھی مکرم کی شکل سے اتنی ہی نفرت کرتے ہیں، جتنی دو سال پہلے کرتے تھے، تو میں بھلا اُنکے پاس اس معصوم کو لیکر کیوں جاؤں گی؟''آس بھری نظروں سے اُسے دیکھا کہ شاید وہ مان جائے۔

''میں اس بارے میں سوچوں گا۔ابھی بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ تم جب چاہو اس سے ملنے آسکتی ہو۔اور جہاں تک ذمے داری لینے کی بات ہے، جب مجھے مناسب لگے گا، میں خود کہہ دوں گا'' اس بات پر اُسکا چہرہ کھلا۔ چلو وہ اتنے پر تو راضی ہوا۔

''میری نائٹ ڈیوٹی ہے، میں آرام سے دن کے وقت مکرم کو سنبھال سکتی ہوں۔''اُس نے کہا۔جواباً مقدّم نے سر ہلایا۔

''سوات کا موسم اتنا اچھا ہے، اور ایک کراچی ہے۔جنوری میں بھی اتنی تیز دھوپ، وہاں تو ہر شے برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔میرا تو آنے کو دل ہی۔۔۔''وہ بولتی گئی اور بولتی ہی چلی گئی، سوات کا موسم، وہاں کے حالات، اُسکی کولیگ ماریہ جو اُسکے ساتھ سوات آنا چاہتی ہے، اُسکی نانی کی پڑوسن جو اپنی شاطر بہن کی شادی، اُسکے ماموں سے کروا کر جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں، اُسکے سینئرز ڈاکٹر جو سارے کام کا بوجھ ینگ ڈاکٹرز پر ڈال دیتے ہیں، مریض کے گھر والے جو ڈاکٹر کو قصائی سمجھتے ہیں۔الغرض، ہر وہ بات جس سے مقدّم کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا اور جسے جاننے میں اُسے رتّی بھر دلچسپی نہ تھی۔وہ صرف بولتی تھی، اُس کے جواب کا انتظار نہیں کرتی تھی۔اُسے مطلق پرواہ نہیں تھی کہ وہ اس گفتگو کا حصّہ بننا چاہتا ہے یا نہیں، لیکن چونکہ وہ اُسی سے مخاطب تھی تو وہ چاہے یا نہ چاہے، وہ اُسے گفتگو کا حصّہ بنا چکی تھی۔اُسکا دل کر رہا تھا کہ اپنا سر دیوار پر دے مارے۔

''تمہاری ڈیوٹی کب سے شروع ہوتی ہے؟''بلآخر اُس کا ضبط جواب دے گیا۔

''رات آٹھ بجے۔آج پہلا دن ہے نا تو ذرا جلدی جاؤں گی۔نروس بھی بہت ہوں''

''تو تمہیں نہیں لگتا کہ تمہیں جانا چاہیے''اتنا منہ پھٹ تو وہ کبھی نہیں رہا تھا۔مقدّس نے گھڑی دیکھی اور سر پر ہاتھ مارا۔

''صحیح کہہ رہے ہو، مجھے چلنا چاہیے''اُس نے مکرم کو سینے سے بھینچ کر خوب سارا پیار کیا اور اُسے بلآخر مقدم کے حوالے کیا۔

''تمہارا کافی وقت لیا، بہت معذرت''چلو اُسے احساس تو ہوا۔

''میں کل آؤں گی۔انشاءاللہ''

''کیا مطلب کل پھر آؤ گی؟''وہ بھونچکارہ گیا۔اُس نے خفگی سے اُسے دیکھا۔

''میرا مطلب تم مصروف ہوتی ہو گی، روز روز آنے کے لیے کیسے وقت نکالو گی؟''شرمندہ ہوتے وضاحت دی۔

''آپ فکر نہ کریں، جب تک آپ مجھے ذمے داری دینے کا فیصلہ نہیں کرتے، میں اپنے چھوٹو سے ملنے آتی رہوں گی''

''چھوٹو؟''

''ہاں!!''

''اُف! مکرم نام ہے اُسکا''

''میرا بھانجا ہے، میری مرضی جس بھی نام سے پکاروں''لٹھ مار انداز میں کہتی وہ جا چکی تھی۔ پیچھے کھڑا مقدّم سر پکڑ کر رہ گیا۔

''اچھی مصیبت ہے''

-------+--------+--------

''تم آخر گھور کیوں رہے ہو مجھے؟'' دبے دبے لہجے میں سوال کیا ہے۔

''تم میری جیبیں خالی کرتی رہو اور میں گھوروں بھی نہ؟'' دانت کچکچاتے ہوئے جواب دیا گیا۔

''کیا ہے؟ گھر کا ضروری سامان ہی تو خرید رہی ہوں''ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گئی، یقیناً اس سے مزید بحث میں نہیں الجھنا چاہتی تھی، لیکن وہ بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا؟ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

''بلکل! یہ ہیئر ماسک، یہ چارکول ماسک، یہ طرح طرح کے فوڈ کلرز، کیک کے مختلف اقسام کے سانچے، یہ نیل پینٹس کے پیکٹس یہ گھر کے سامان، میں اور بچے ہی تو استعمال کرتے ہیں اور یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟'' سامان گنتے گنتے وہ ٹھنکا، وہ اُسے نظر انداز کرتی ریک میں رکھے سامان اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''ھدا بیوٹی؟ یہ بھلا کیا شے ہے؟'' وہ اس عجیب سی شے کو الٹ پلٹ کے دیکھنے لگا۔

''سر! یہ آئی شیڈو پیلیٹ ہے۔'' پاس کھڑی سیلز گرل نے مشکل آسان کی تھی۔

''یہ۔۔۔ یہ آئی پیلیٹ ہے؟ سولہ ہزار روپے کا؟'' اُس نے آنکھیں پھاڑ کے قیمت دیکھی۔

''جی سر! یہ تو رعایتی قیمت ہے۔ بلکل اوریجنل پیس ہے۔'' سیلز گرل نے دانت نکالتے ہوئے کہا، وہ اُسے نظر انداز کرتا آگے کھڑی اپنی بیوی کے سر پر پہنچا۔

''یہ گھر کا سامان ہے؟ سولہ ہزار روپے کا مطلب بھی پتہ ہے؟''

''اتنا اوور ری ایکٹ کیوں کر رہے ہو؟ یہ سب چیزیں اتنی ہی مہنگی ہوتی ہیں۔'' اُسکی بیوی نے حتّی الامکان آواز آہستہ رکھی، پاس کھڑی سیلز گرل کی نظریں جو اُن پر تھیں۔

''تم مجھے کنگلا کرنے پر تلی ہو اور میں ری ایکٹ بھی نہ کروں؟'' ریک کی دوسری جانب کھڑا نوید یہ آوازیں بخوبی سن رہا تھا۔ صبح بشریٰ کو اٹھا کر اُسے ناشتہ اپنے ہاتھوں سے بنا کر دیتے اور اُسے دوائیں کھلاتے اُس نے ہر طرح سے اُسے نظر انداز کیا تھا۔ اُسکے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ قبرستان گئی تھی۔ اب ناراضگی دکھانا اُسکا حق تھا۔ اور رہی بات بشریٰ کی تو اُسکی رات والی حالت اب کافی سنبھل گئی تھی۔ اور اب

اُسے مکمل احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے کتنی سنگین غلطی کی تھی۔ ناشتے کے بعد اُس سے کوئی بھی بات کیے بنا وہ مارٹ چلا آیا تھا۔ صبح کا وقت تھا، رش بھی زیادہ نہیں تھا۔ وہ سکون سے گھر کی ضروری اشیاء خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن۔۔۔ ریک کی دوسری جانب سے مسلسل آتی آوازوں نے اُسکے سکون میں ٹھیک ٹھاک خلل ڈالا تھا۔ وہ دونوں جو کوئی بھی تھے، گفتگو سے میاں بیوی لگتے تھے۔

''میں بتا رہا ہوں بیگم صاحبہ! آپ کی ان شاہ خرچیوں سے میں بہت جلد سڑک پر کھڑا چندہ جمع کر رہا ہوں گا'' بہت عرصے بعد نوید کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ اُبھری تھی۔ ناچاہتے ہوئے بھی وہ اس گفتگو سے محظوظ ہوا تھا۔ اُن سے آہستہ آواز میں بات کرنے کی درخواست والے، اپنے تھوڑی دیر پہلے کے ارادے کو ترک کرتا وہ اس حصے باہر نکلا۔ اور اُسکی ساری مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

قسمت بھی کیا عجیب شے ہے؟ جب نہیں ملانا تھا تو دس سال نہ ملایا اور جب ملانے پر آئی تو اُن میں سے ہر ایک کو بہانے بہانے سے اُسکے سامنے لا کھڑا کر رہی تھی۔ ورنہ پہلے بھی یہی شہر تھا۔۔۔ اور وہ اسی شہر کے رہنے والے۔ پہلے تو اس طرح کسی سے سامنا نہ ہوا تھا۔

سامنے اپنی بیوی سے نوک جھونک میں مصروف وہ شخص، جسکی آواز وہ نہ جانے کیوں نہیں پہچان سکا تھا؟ وہ حسین تھا۔ حسین مرتضیٰ۔۔۔

اُسکی بیوی اُس سے پیلیٹ چھین کر واپس ٹرالی میں ڈال کر بلنگ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پیچھے وہ مصنوعی خفگی چہرے پر سجائے آ رہا تھا، اسی اثناء میں کسی بزرگ پچانے کوئی جملہ کسا تھا، غالباً وہ بھی اُسکی گفتگو سن رہے تھے۔ بزرگ کی بات سن کر وہ بیساختہ ہنسا تھا، جبکہ اُسکی بیوی کینہ توز نظروں سے اُسے گھور رہی تھی۔ ہنستے ہوئے اُسکے دونوں گالوں پر گہرے گڑھے پڑتے تھے۔ زندگی اُسکی آنکھوں میں جیتی تھی، اور وہ آج بھی وہیں تھی۔ حسین نہیں بدلا تھا۔۔۔ بلکل نہیں بدلا تھا۔

بلنگ کاؤنٹر پر کھڑے اپنی بیوی کو بار بار تنگ کرتے، حسین کی نظریں ایک مرتبہ بھی نوید پر نہیں پڑی تھیں۔

''یہ پیسے لو، اور بل ادا کر کے سامان لے آؤ۔ میں گاڑی میں ہوں'' نوید نے جیب سے کچھ نقد رقم نکال کے پیچھے کھڑے ملازم لڑکے کو دی اور ٹرالی بھی اُسے پکڑا دی، پرانے ملازمین میں یہ لڑکا واحد تھا، جسکی جگہ برقرار تھی۔ وجہ اُسکا کل چھٹّی پر ہونا تھا۔

مطلوبہ رقم اُسے پکڑانے کے بعد ایک نظر اپنے اِرد گرد سے بے نیاز حسین پر ڈالی اور گہری سانس لیکر، آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگاتے وہ مارٹ سے باہر نکل گیا۔

اور اپنی سروس کے آٹھ سالوں میں پہلی بار۔۔۔

ایس ایس پی نوید عالم ڈر گیا تھا۔

وہ حسین کی بھرپور شخصیت، اُسکی معصوم مسکراہٹ اور اُسکی خوشحال زندگی سے ڈر گیا تھا۔

وہ اُسکے مستقبل میں آنے والے خطرے سے ڈر گیا تھا۔

اور ایس ایس پی نوید عالم اُس سے نظریں چرا گیا تھا۔

-------+--------+--------

سردی غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی، گہرے نیلے اور آف وائٹ رنگ کے سوٹ پر لمبا سویٹر پہنے وہ اس وقت بچوں کو اپنے گرد اکھٹا کیے کوئی کہانی سنا رہی تھی۔ سب اتنی دلچسپی سے سن رہے تھے کہ پورے گھر میں بس جزا کی ہی آواز گونج رہی تھی۔

''تو پھر صبر کیا ہوتا ہے؟'' کہانی مکمل کر کے اس نے بچوں سے سوال کیا۔ لمبے بالوں کی چٹیا بنا رکھی تھی۔ ایک آدھ لٹیں چہرے کے ارد گرد جھول رہی تھیں۔

''جب آپکو تکلیف ہو تو آپ نہ شکایت کریں نہ غصّہ کریں۔ صرف اللہ سے دعا مانگے اور شکر ادا کریں'' ایک تیرہ سالہ بچی نے کہا۔

''بلکل۔۔'' اُس نے تائید کی۔

''مس! اگر کوئی تکلیف میں روئے تو کیا وہ بھی بری بات ہے؟'' ایک نو دس سالہ بچے نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''رونا گناہ نہیں ہے، بلکہ رونا تو اللہ کی طرف سے رحمت ہے۔ اگر انسان روئے گا نہیں، تو وہ سخت دل ہو جائے گا۔ انسان کو بین نہیں کرنا چاہیے۔ بین کرنا یعنی چیخنا چلانا، بال نوچنا، منہ پر تھپڑ مارنا۔ یہ سب گناہ ہے''

''جب مجھے تکلیف پہنچی تھی تب میں بھی بس رویا تھا۔ میں نے بین نہیں کیا تھا۔ تو کیا میں نے بھی صبر کیا؟'' اُس بچے نے سمجھداری سے پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' جزا نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر رکھتے ہوئے کچھ حیرت سے اُسے دیکھا۔

''عثمان''

''تم نے صبر کیا عثمان! اللہ تعالیٰ تم سے بہت خوش ہوں گے۔'' اُس نے پیار سے جواب دیا۔

''چلو بچوں! اب باری باری باغبانی کا سامان لیکر لان میں جمع ہو، ہم پودے لگائیں گے'' اُس نے کہا تو بچے خوشی سے شور مچاتے ہوئے باہر بھاگنے لگے۔ وہ اُنہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی کہ ہاتھوں میں چائے کا مگ پکڑے رضا چلا آیا۔ اُسے دیکھ کر مسکرایا تو جواباً وہ بھی مسکرا دی۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر کھڑے، لان میں جمع ہوتے بچوں کو دیکھنے لگے۔

''عثمان جب آٹھ سال کا تھا، تب مجھے برن وارڈ میں ملا تھا۔'' رضا کی آواز پر اُسکی مسکراہٹ سمٹی، رخ موڑ کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ بلیک ٹراؤزر پر وائٹ ہڈی پہنے، جسکا ہڈ پیچھے گرایا ہوا تھا، اُسکی نظریں کھڑکی سے نظر آتے، لان میں جمع ہوتے بچوں پر تھیں۔

''برن وارڈ؟''

''ہاں! تھرڈ ڈگری برننگ تھی'' ایک اور جھٹکا۔ جزا کا دل ڈوب کر اُبھرا۔

''کیسے جلا تھا؟'' ہمت کر کے پوچھا۔

''ماں باپ کے مرنے بعد، تایا اُسے اپنے پکوان سینٹر لیکر جاتا تھا۔ کام غلط ہونے پر اُسے بہت مارتا تھا۔ لاتوں سے۔۔۔ گھونسوں سے'' وہ اب بھی باہر ہی دیکھ رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر کوئی اذیت رقم تھی۔ وہ دم سادھے اُسے سن رہی تھی۔

''ایک دن ایسی ہی کسی غلطی پر اسکے تایا نے اُسے مارا اور غصّے سے دھکا دیا۔ پیچھے دیگ چولہے پر چڑھی ہوئی تھی۔'' رضار کا اور رخ پھیر کر اُس کی جانب دیکھا۔

''وہ دیگ سے جا کر ٹکرایا اور کھولتے سالن کی دیگ اُس پر الٹ گئی۔'' جزا کو لگا کسی نے اُسکا دل آری سے چیرا ہو۔

''اللہ کی مرضی کے اُسکا چہرہ بچ گیا، باقی سارا جسم جھلس گیا تھا۔ اُسکا تایا اُسے سرکاری ہسپتال کے برن وارڈ میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بعد میں جب اُسے گرفتار کر کے سی سی ٹی وی فوٹیج نکالی گئی تو اس سے صاف واضح ہو گیا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اُسے جلانا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا لاپرواہی میں ہی ہوا۔ لیکن اتنے چھوٹے بچے کو اس بری طرح مارنا بھی جرم ہے۔ لٰہذا اب وہ اپنی سزا کاٹ رہا ہے'' بات مکمل کر کے جزا کو دیکھا۔ سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ سانولا چہرہ ضبط کی شدت سے لال ہو رہا تھا۔ اُس نے فوراً چہرہ موڑ کر عثمان کی جانب دیکھا جو بچوں کے ساتھ چہکتا، کھیلتا کہیں سے بھی اس اذیت سے گزرا ہوا نہ لگتا تھا۔ ہاں! اُس نے واقعی صبر کیا تھا۔ رضا کو اُسے دیکھ کر دکھ ہوا۔ اُسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔

''باغبانی نہیں کرنی؟'' اُس نے اچانک سے پوچھا تو جزا نے آنسو اندر دھکیلتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''اپنا گارڈن خراب کرنے کی اجازت دے رہے ہو مجھے؟''

''بچے روز ہی کرتے ہیں۔ تم بھی کر لو گی تو کیا ہو جائیگا؟'' مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا۔ ناک میں چمکتی لونگ اُس پر اتنا جچتی تھی کہ کوئی حد نہیں۔۔۔

''بچوں کی توڑ پھوڑ اور چیزیں خراب کرنے سے تمہیں کوفت نہیں ہوتی؟'' اُس نے جانچتی نظروں سے پوچھا۔

''نہیں، بچے چیزیں خراب نہیں کرینگے تو کون کریگا جزا؟ اگر بچے بڑوں کی طرح سلیقہ منداور نفاست پسند ہو گئے تو پھر وہ بچے تو نہ رہے۔ وہ سیکھتے ہیں اور سیکھنے کے عمل میں غلطیاں ہوتی ہیں۔'' جزا نے دیکھا تھا کہ بچوں کے موضوع پر وہ گھنٹوں بات کر لیتا تھا۔

''بچے انتظار کر رہے ہیں'' وہ جانے لگی تو پیچھے سے رضا نے کہا۔

''میں جامعہ کراچی اور مختلف نجی جامعات کی وزٹنگ فیکلٹی میں شامل ہوں۔ اُسکے علاوہ میرے اسکول کی چالیس برانچز اس شہر میں ایکٹو ہیں۔''

''تو؟'' اُس نے ناسمجھی سے رک کر اُسے دیکھا۔ بھلا وہ کیوں اُسے بتا رہا تھا؟

''تم کل سوچ رہی تھی نہ کہ بنا فنڈز اور خیرات کے ان بچوں کے اخراجات کیسے پورے ہو رہے ہیں؟ اسی لیے سوچا کہ تمہیں اپنا ذریعہ آمدنی بتا دوں'' سنجیدگی سے جواب دیتے چائے کا کپ منہ سے لگایا کہ کہیں اُسکی مسکراہٹ نہ دیکھ لے۔

''اف!!''ساری مسکراہٹ اُڑن چھو ہوئی تھی۔''میں ایسا کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔''

''اچھا!!''اچھا کو ذرا لمبا کھینچا''مجھے تو کچھ ایسا ہی لگا تھا''مزید تپانے والی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

''جو بھی تمہیں لگے اُس پر یقین مت کر لیا کرو''غصّے سے پاؤں پٹختی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تو وہ ہنس دیا۔

-------+--------+--------

آگ تھی۔۔۔ہر طرف آگ تھی۔اُسکے آگے بھی۔۔۔اُسکے پیچھے بھی۔۔۔

آگ اُسکے آس پاس کی ہر شے جلا کر راکھ کر رہی تھی،انسانی وجود خاک کر رہی تھی۔۔۔

لیکن اس آگ سے وہ کیوں نہیں جل رہا تھا؟۔۔۔

آگ اُسے کیوں نہیں جلا رہی تھی؟۔۔۔

وہ چیخنا چاہتا تھا۔۔۔پر چیخ نہیں پا رہا تھا۔۔۔

بھاگنا چاہتا تھا۔۔۔پر ہل بھی نہ پا رہا تھا۔۔۔

اگلے ہی لمحے ایک جھٹکا لگا اور اُسکی آنکھ کھل گئی۔بشریٰ اُسکے سر پر پریشان حال سی کھڑی تھی۔سر تکیے سے اٹھا کر آس پاس دیکھا۔وہ اپنے کمرے میں تھا۔

''الارم کب سے بج رہا ہے۔تم اُٹھ کیوں نہیں رہے؟''اُس نے پوچھا۔

''اُٹھ رہا ہوں،تم جاؤ''سر واپس تکیے پر گرایا۔بشریٰ نہیں گئی،بلکہ وہیں کھڑی رہی۔ نوید کو اُسکی وہاں موجودگی کا احساس ہوا تو اُٹھ بیٹھا۔

''اب کیا ہوا؟''

''تم اب تک ناراض ہو؟''دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''نہیں ہونا چاہیے؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔پچھلے دو روز سے وہ اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔اور یہ اب تک کی سب سے لمبی ناراضگی تھی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں،دوبارہ ایسا نہیں کروں گی۔''وہ اُسکے سامنے ہی آ کر بیٹھ گئی۔

''ایسے وعدے تم پہلے بھی بہت مرتبہ کر چکی ہو''

''سوری کہہ تو رہی ہوں''اُسے کچھ سمجھ نہ آیا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔وہ نرم پڑا۔

''بشریٰ!میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا،لیکن اب بتانا ناگزیر ہے۔''اُسکے دونوں ہاتھ تھام کر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''سب خیریت ہے؟''وہ پریشان ہوئی۔

''میرے کچھ دشمن ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں۔ دیکھو میں نے ملازمین کو بھی پتہ نہیں چلنے دیا کہ تم قبرستان جاتی ہو۔ لیکن پھر بھی اُنہیں خبر ہوگئی۔ اگر کسی کو بھی تمہارے آنے جانے کی خبر ہوئی تو وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تمہارے لیے محفوظ جگہ گھر ہے۔ اور گھر سے باہر تمہیں میرے ساتھ ہی جانا چاہیے۔''

''میں آئندہ احتیاط کروں گی۔''اُس نے یقین دلایا۔ اس ساری گفتگو میں اُسکی فکر صرف اور صرف بشریٰ تھی، بچوں کا کہیں ذکر ہی نہ کیا۔

''لیکن تم؟''اُس نے پریشانی سے نوید کو دیکھا۔

''میری فکر نہ کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ بس اپنا خیال رکھو''آرام سے کہتے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو جاؤ! ناشتہ لیکر آؤ میرے لیے۔۔۔ دو دن سے اپنے ہاتھوں سے بنا رہا ہوں۔ آج تم ناشتہ بناؤ''چپل میں پاؤں ڈالتے ہوئے اُسے کہا۔

''ارے! میں تو بچوں کے لیے دودھ چڑھا کر آئی تھی چولہے پر۔''سر پر ہاتھ مارتی وہ باہر بھاگی تھی۔ نوید اُسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

دکھ سے۔۔۔

حزن سے۔۔۔

اذیت سے۔۔۔

-------+--------+--------

صبح صبح دروازے کی گھنٹی بجی، وہ آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ ٹائی کی گرہ لگاتے وہ دروازے پر آیا۔ دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔

''السلام وعلیکم!''سلام کرنے کے بعد مقدّس کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور اندر داخل ہوگئی۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

''تم اتنی صبح صبح؟''دروازہ بند کر کے اُسکے پیچھے پیچھے آیا جواب اندر آچکی تھی۔

''ہاں! تم آفس جاؤ گے تو مکرم کی ذمے داری میری ہوئی نہ۔۔''سکون سے جواب دیا۔

''لیکن میں نے تمہیں ابھی اسکی ذمے داری نہیں دی ہے۔''اُس نے جتایا۔

''لیکن میں نے تو لے لی''مقدّس نے بھی جتاتے ہوئے اپنے بیگ سے بہت سارا سامان نکالا جو وہ غالباً مکرم کے لیے لائی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مکرم اُسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے اچھل رہا تھا اور اُسکی گود میں آنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

''چھوٹو نے ناشتہ کر لیا؟''اسکو گود میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''مکرم!!''گھورتے ہوئے تصیح کی۔

''نہیں! ابھی ہی اٹھا ہے۔ میں بس اُسکا دودھ ہی بنانے ہی جا رہا تھا۔''

''ٹھیک ہے! میں بنا دیتی ہوں''ایک بار پھر اُسکے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہ کچن میں جا کھڑی ہوئی۔ اب ایک ایک شے اُلٹ پلٹ کر مطلوبہ چیزیں تلاش کر رہی تھی۔ مقدّس ضبط کیے اپنے کمرے میں آگیا۔ دروازہ بند کر کے فون اٹھایا اور اخلاق کو کال ملائی۔

''شکر! تم نے فون کیا۔ ورنہ مجھے لگا تھا تمہیں منانے کے لیے کراچی آنے پڑے گا''فون اٹھاتے ہی اخلاق کی آواز سنائی دی۔

''منانے کے لیے؟ میں کب ناراض تھا تم سے؟'' وہ حیران ہوا۔

''کیا مطلب؟ تم مجھ سے ناراض نہیں تھے؟'' وہ اُس سے بھی زیادہ حیران ہوا۔

''چھوڑ و یار اس بات کو، یہ بتاؤ۔۔۔ کس نمونی شے کو بھیج دیا ہے تم نے؟'' مقدّم نے چڑ کر پوچھا۔

''مقدّس کی بات کر رہے ہو؟''اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''

''کل فون آیا تھا اُسکا۔۔۔ تمہاری تعریف کر رہی تھی''اُس نے شرارت سے کہا۔

''میری تعریف؟ حالانکہ ایسا کوئی متاثر کن تاثر نہیں چھوڑا میں نے'' وہ حیران ہوا۔

''وہی تو۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی اخلاق بھائی! آپکے بھائی کا نام بداخلاق ہونا چاہیے''اُس نے ہنستے ہوئے کہا تو اُس نے منہ بنایا۔

''ٹھیک ٹھاک جینا حرام کیا ہوا ہے اُس نے کل سے''

''تمہیں مسئلہ کیا ہے؟ وہ مکرم کا خیال صحیح سے رکھ رہی ہے ناں؟ اب ذمے داری دی ہے تو برداشت بھی کرو''

''میں نے ذمے داری دی ہے کہاں ہے؟ اُس نے خود ہی لے لی ہے'' وہ بڑبڑایا۔ پھر اخلاق سے دو ایک باتیں کرنے کے بعد وہ نیچے چلا آیا۔ وہاں وہ قالین پر بیٹھی ڈھیروں کھلونے پھیلائے مکرم کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ شدید صدمے کے عالم میں اپنے قالین کو دیکھتے ہوئے وہ وہیں چلا آیا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟ مکرم ڈھونڈ رہا تھا تمہیں۔۔'' اُسے دیکھتے ہی بولی۔

''اخلاق کا فون آگیا تھا۔ اُسی سے بات کر رہا تھا''ناچاہتے ہوئے بھی جواب دیا۔

''ایک بات پوچھوں؟''اُسکی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا اور ہمیشہ کی طرح جواب کا انتظار کیے بنا بولی۔

''تمہیں اور اخلاق بھائی کو کبھی ساتھ دیکھا نہیں۔ تم دونوں کی مائیں بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتی تھیں۔ پھر اچانک سے اتنا بھائی چارہ کہاں سے آگیا؟''اُس نے سوال کر کے مقدّم کو دیکھا، جسکے چہرے پر ناگواری کے اثرات صاف نظر آرہے تھے۔

''اچھا اچھا! میں سمجھ گئی۔ اتنا ذاتی سوال نہیں پوچھنا چاہیے'' وہ اُسکے بولنے کا انتظار کرتی ہی کب تھی؟ ملازم اُسکا ناشتہ لے آیا، تو وہ ناشتہ کرنے لگا۔

''تم نے انٹیریر کس سے کروایا؟''اُس نے چند لمحے بھی چپ نہ رہنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ مقدّم نے آبرو اچکا کے اُسے ناسمجھی سے دیکھا۔

''یعنی تمہارے لاؤنج کی سیٹنگ بہت اچھی ہے۔ نائس چوائس'' اُس نے داد دی۔

''گھر سجانا بھی ایک فن ہے ویسے،اب میری نانی تو بوڑھی ہو چکی ہیں۔گھر سجانے کا اُنہیں کوئی شوق رہا نہیں ہے۔ماموں کی چوائس اتنی خراب ہے کہ توبہ۔۔۔بلیک اور براؤن تھیم ہے نانی کے ڈرائنگ روم کی،اور ماموں سفید رنگ کے کارنرز اٹھا کے لے آئیں''

''اچھا!''اُس کو سمجھ نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے؟

''تم نے بتایا نہیں انٹیریر کس سے کروایا؟''اُس نے پھر سوال کیا۔

''کسی کمپنی سے کروایا تھا۔اب یاد نہیں آرہا کہاں سے کروایا تھا؟باقی سیٹنگ تو میں خود ہی کرتا ہوں''وہ سکون سے ناشتہ کرنا چاہتا تھا اور کر نہیں پا رہا تھا۔

''اور تمہارے آفس کی سیٹنگ؟وہ بھی تم نے خود کی ہے؟''ایک اور سوال۔

''نہیں،آفس اتنا بڑا ہے کہ میں اُسکی سیٹنگ خود نہیں کر سکتا''

''کتنا بڑا ہے تمہارا آفس؟''ایک اور سوال۔

''پتہ نہیں!میں نے ناپا نہیں کبھی''وہ بیزار ہوا۔

''میرا مطلب کتنے ایمپلائیز ہیں؟''

''دو سو!''مختصر جواب دیا۔

''اچھا میں کیا سوچ رہی تھی کہ۔۔۔''وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مقدّم نے فوراً اُسکی بات کاٹی۔

''میں مکرم کے دن بھر کے کھانے پینے،اور سونے کی ٹائمنگ تمہیں میسیج کر دوں گا۔اسے اُسی حساب سے کھلانا پلانا۔اور اُسکے سیریلز کا نام بھی بتا دوں گا''اُس نے کہا تو وہ خوش ہوئی،یعنی وہ اُسے ذمے داری دینے پر راضی ہو گیا تھا۔

''اُسکی ضرورت نہیں ہے۔مجھے معلوم ہے اسکو کیا کھلانا ہے اور کب''

''اور تمہیں کیسے معلوم؟''اُس نے پوچھا۔

''میں چائلڈ سپیشلسٹ ہوں شاید۔۔۔''اُس نے یاد دلایا۔

''مجھے یہ بات ابھی معلوم ہوئی ہے''اُس نے بھی جتایا۔

''تمہیں کتنی دیر میں نکلنا ہے؟''سوالات کرنا اُسکا پسندیدہ کام تھا۔

''تم ایک کام کرنا کل سے یہاں مت آنا''غیر متوقع جواب پر مقدّس پہلے حیران ہوئی اور پھر اُسے برا لگا۔ لیکن مقدّم نے نوٹس نہیں کیا۔

''تمہارا روز میرے گھر آنا ٹھیک نہیں ہے۔کل سے میں مکرم کو ناشتہ کروا کے،اُسکے ضروری سامان کے ساتھ خود اُسے تمہارے گھر چھوڑتے ہوئے آفس جاؤں گا۔اور واپسی پر لے لوں گا''اُس نے اپنی بات مکمل کی۔اچھا!تو وہ یہ کہہ رہا تھا۔خوامخواہ برا مان رہی تھی وہ،

صحیح تو کہہ رہا تھا۔ اُسکے بعد جتنی دیر مقدّم وہاں رہا وہ اسی طرح اُسکا دماغ کھاتی رہی۔ یہاں تک کہ اُس دن وہ آدھے دماغ کے ساتھ آفس گیا تھا۔ کم از کم اُسے تو ایسا ہی لگتا تھا۔

-------+--------+--------

''ہمیں جتنا جلدی ہو مائیکل تک پہنچنا ہے۔ خلیل کے لیے ہماری کارروائی تیز ہو چکی ہے۔''ڈی آئی جی صاحب اس وقت نوید کے ساتھ بیٹھے تھے۔

''ہم جلد بازی میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتے۔ تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔''نوید نے کہا۔

''حسین مرتضیٰ بھی اب تک پاکستان نہیں آیا۔''اس بات پر وہ چونکا۔

''نہیں! حسین پاکستان میں ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''وہ حیران ہوئے۔

''میں نے کل صبح اُسے اپنی بیوی کی ساتھ مارٹ میں دیکھا تھا۔ وہ وہاں خریداری کر رہا تھا''

''اگر وہ کل صبح تمہیں مارٹ میں دکھا ہے تو اسکا مطلب اُسے آئے ہوئے بھی تین چار دن ہو چکے ہیں۔ اور ڈیپارٹمنٹ والوں نے مجھے کوئی اطلاع نہیں دی؟''وہ برہم ہوئے۔

''ہو سکتا ہے وہ کل ہی آیا ہو''نوید نے وضاحت دینی چاہی۔

''کون شخص وطن واپس آتے ہی پہلے مارٹ پہنچ جاتا ہے؟ ذرا سوچو!''اُنکی بات ٹھیک تھی۔ نوید خاموش ہوا۔ اُنہوں نے اے ایس پی فیصل کو بلوایا۔ پہلے تو اُسے اطلاع نہ دینے پر سرزنش کی پھر بولے۔

''مجھے ہر حال میں آج ہی حسین سے ملاقات کرنی ہے۔ یہ معاملہ مزید ملتوی نہیں ہونا چاہیے۔''

''سر! آج فوراً؟ ابھی تو اُنھیں اطلاع دینی ہو گی، پھر ملاقات کیلئے بلانا ہو گا۔ جلد بازی کی تو وہ خوفزدہ ہو سکتے ہیں''فیصل نے کہا۔

''ڈیٹس ناٹ مائی پروبلم (یہ میرا مسئلہ نہیں ہے)۔۔۔ تم آج شام تک ہی میری حسین سے ملاقات رکھو گے، اس طرح کہ وہ خوفزدہ نہ ہو۔ کیسے کرتے ہو؟ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔''اُنہوں نے سختی سے کہا۔

''اور ہاں! ڈیپارٹمنٹ والوں کو بتا دینا کہ اس نااہلی کا حساب میں ضرور لوں گا''اُنہوں نے سختی سے کہہ کر اُسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ ڈی آئی جی صاحب کا خوف تھا کہ شام تک واقعی حسین اُنکے سامنے تھا۔ اب فیصل نے یہ کیسے کیا؟ یہ وہی جانتا تھا۔

''تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی مجھے مارنے والا ہے؟''ساری گفتگو سننے کے بعد اُس نے پہلا سوال کیا تھا۔

''کسی نے تمہیں مارنے کی پوری تیاری کر لی ہے۔ اور یہی سچ ہے''اس جواب پر وہ ہنسا۔ اس ہنسی کا کوئی مقصد سمجھ نہ آ سکا۔

''مذاق کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اور ہم ایسا کیوں کریں گے؟''اُنہوں نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے پوچھا۔

''اور میں آپ کی بات پر یقین کیوں کروں؟''

''تمام شواہد دیکھنے کے بعد بھی؟'' اُنکے سوال پر اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''کوئی مجھے کیوں مارنا چاہے گا؟''وہ ڈنائیل فیز میں تھا۔جو کچھ وہ سن رہا تھا اُس پر یقین کرنا آسان بھی نہ تھا۔فرّخ صاحب نے پانی کا گلاس اُسے تھمایا۔اُس نے چند گھونٹ لیے اور گلاس رکھ دیا۔پھر متفکر چہرے سے اُنہیں دیکھا۔

''میری کسی کے ساتھ، کسی بھی قسم کی دشمنی نہیں ہے۔میں نے تو آج تک کسی سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔''وہ بے بسی سے بولا تھا۔دوسرے کمرے میں بیٹھ کر یہ ساری گفتگو سنتے نوید کا دل کٹا تھا۔یہی تو وہ نہیں چاہتا تھا۔وہ حسین کو بے بس، لاچار اور خوفزدہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔لیکن زندگی میں سب کچھ ویسے نہیں ہوتا جیسے ہم چاہتے ہیں۔

''تمہیں اس بات کو قبول کرنا ہوگا۔اگر تم ہی تسلیم نہیں کروگے تو ہم معاملے کی تہہ تک کیسے پہنچیں گے۔ابھی گھر جاؤ۔تھوڑا وقت لو، سوچو کہ ماضی میں کبھی کسی سے دشمنی رہی ہو؟کوئی بھی چھوٹی بات۔۔۔میں جب دوبارہ بلاؤں تب تک اُمید ہے کہ تم حالات قبول کر چکے ہو۔''اُنہوں نے سمجھایا۔

''میرے دو بچے ہیں، بہت چھوٹے۔۔۔میری ایک فیملی ہے۔میں کیسے اُنہیں یہ بتادوں کہ کوئی مجھے مارنا چاہتا ہے؟''نوید نے کرب سے آنکھیں میچیں۔۔۔آدمی کی زندگی کا محور بس یہی شے ہوتی ہے۔اُسکے بیوی بچے اور اُسکے ماں باپ۔۔۔

''مت بتاؤ اُنہیں، وقت آنے پر بتادینا۔ابھی سے پریشان نہ کرو۔اور یقین کرو ہم تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ان شاءاللہ''

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔مجھے مارنے والا میرے گھر والوں کو نقصان نہ پہنچائے یہ کیسے مان لوں میں؟''حقیقت تسلیم کرنے کے بعد پہلی فکر اُسے اپنے گھر والوں کی ہی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا ایسا، ہم یہاں ایسے ہی نہیں بیٹھے۔اس کیس کو بہت قریب سے مانیٹر کیا جارہا ہے۔تم لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔یہ میرا وعدہ ہے''فرّخ صاحب کے مضبوط لہجے پر وہ خاموش ہوا۔کچھ دیر اُس سے مزید باتیں کرنے کے بعد انہوں میں اُسے جانے۔نوید چاہ کر بھی اُسکے سامنے نہیں جاسکا تھا۔لیکن اُس نے دیکھا تھا۔وہ جن قدموں سے آیا تھا۔اُن قدموں سے واپس نہیں جارہا تھا۔

یہ وہ حسین نہیں رہا تھا جسے کل اُس نے مارٹ میں دیکھا تھا۔

اور یہی وہ نہیں چاہتا تھا۔۔

اسی چیز سے وہ کل ڈر گیا تھا۔۔۔

-------+--------+--------

گاڑی گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اُسکے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ شاید اُسکے ابّا اپنی موٹر سائیکل اندر کھڑی کر رہے تھے۔ کھلے دروازے سے اُسکے دونوں بچّے لان میں کھیلتے نظر آ رہے تھے۔ اُسکی بیوی قریب کھڑی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ وہ ایک مکمل منظر تھا۔

کیا اُسے اندر جانا چاہیے؟

کیا اُسے اپنے گھر والوں کو اُس خطرے سے آگاہ کرنا چاہیے؟

کیا اُسے ان مسکراتے چہروں سے خوشی چھین لینی چاہیے؟

کیا حسین ایسا کر سکتا تھا؟

اُسکے ابّا گاڑی پارک کر چکے تھے۔ اُسکی بیوی اب دروازے کے پاس آ کر اُسے بند کر رہی تھی۔ حسین کی گاڑی گلی کے کونے پر تھی، جہاں سے وہ یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، اسی لیے وہ اُسے دیکھ نہ سکی۔ یا شاید وہ ہمیشہ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ چیزوں پر اتنا دھیان نہیں دیتی تھی۔

حسین نے اُسی لمحے فیصلہ کیا کہ وہ ان سب معاملوں میں کسی کو بھی شامل نہیں کریگا۔ یہ مسئلہ اُسکا تھا اُسے اکیلے جھیلنا تھا۔

وہ کسی کو نہیں بتائے گا۔ اپنی بیوی کو بھی نہیں۔

اُسکی بیوی۔۔۔ اُسکی چہیتی بیوی۔۔۔

حورعین مصطفیٰ۔۔۔

جسکی ہنسی ہر طرف جلترنگ بکھیر دیتی تھی۔۔۔

جسکی شرارتیں حسین کا دل موہ لیتی تھی۔۔۔

جو اُسکے ہر غم بھلا دیتی تھی۔۔۔

جو اُسکے سکھ دکھ کی ساتھی تھی۔۔۔

حورعین مصطفیٰ۔۔۔

حسین کی حور۔۔۔

-------+--------+--------

"احمد! احمد۔۔" لاؤنج میں داخل ہوتا علی اپنے بیٹے کو آوازیں دیتا صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ ٹیبلیٹ پر کوئی خبر دیکھتے سفیر صاحب نے ایک نظر اُسے دیکھا، چہرہ ہمیشہ کی طرح غصّے سے تپ رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ احمد کی یقیناً شامت آنے والی ہے۔ حالانکہ وہ اتنا خاموش مزاج بچہ تھا، طبیعت میں کوئی شرارت نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ ہر دوسرے دن علی کی ڈانٹ پھٹکار کا شکار ہوتا تھا۔ سفیر صاحب کچھ کہہ بھی نہ سکتے

تھے کیونکہ وہ بہت پہلے ہی اُنہیں یہ باور کرواچکا تھا کہ ''میرے اور میرے بیٹے کے معاملات سے دور رہیں''۔ دروازے سے گھبرایا ہوا احمد داخل ہوا۔

''کہاں تھے تم؟ معلوم ہے کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں؟'' اُس نے سختی سے پوچھا تو وہ سہما۔

''اِدھر آؤ۔۔'' علی نے اشارے سے اُسے پاس بلایا۔ وہ سر جھکائے اُسکے پاس آیا۔

''فار گاڈ سیک (خدا کے واسطے)۔۔۔ چپل تو اُتار کر آؤ'' وہ چیخا تو احمد نے ہڑ بڑا کے چپلیں اتاریں۔ وہ ڈر کے چپلوں سمیت ہی قالین پر چڑھ گیا تھا۔

''چھوٹے بچے ہو تم؟ ایک ہی بات کتنی دفع بتانی پڑے گی؟ سارا قالین گندا کر دیا'' حالانکہ وہ چھوٹا بچہ ہی تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اُس نے اپنا موبائل اُسکے سامنے کیا، تو اس نے ایک نظر موبائل کی سکرین کو دیکھا۔ ایک نظر دیکھنے پر ہی اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ اُس نے کیا کر دیا ہے۔ اسی لیے واپس نظریں جھکا دیں۔

''کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کیا ہے یہ؟'' وہ دھاڑا تو سفیر صاحب نے خائف نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میرے اسیسمنٹ کا رزلٹ (نتیجہ)'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''اور کیا نتیجہ آیا ہے تمہارا؟'' اُس نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کم ہے'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''صرف کم ہے؟ باسٹھ فیصد لائے ہو تم۔۔۔ دن بہ دن تمہاری کارکردگی خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آخر کر کیا رہے ہو تم؟''

''سوری بابا!''

''واٹ سوری؟۔۔۔ میں اتنی فیسیں تمہارے اسکول اور ٹیوشن کی اس لیے بھر رہا ہوں کہ تم یہ مارکس لاؤ؟'' وہ سر جھکائے اُسکی ڈانٹ سنتا رہا۔

''آج سے اگلے اسیسمنٹ تک نہ تم فٹبال کھیلو گے، نہ سائیکلنگ کرو گے اور نہ ہی دوستوں کے ساتھ کھیلو گے۔ اب تم مجھے صرف اور صرف پڑھتے ہوئے نظر آنے چاہیے ہو۔'' اُس نے فیصلہ صادر کیا تو اُس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ ایک امید تھی کہ شاید باپ کو ترس آجائے، شاید رحم آجائے یا شاید وہ بھی کبھی اُس سے محبت سے بات کر لے۔ شاید کبھی۔۔۔

''منع کیا ہے نہ کہ مت رویا کرو میرے سامنے۔۔۔'' علی جھنجھلایا تو وہ سر جھکا کے وہاں سے چلا گیا۔ اُس نے گہری سانس لے کر اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ آج ہی اُسکے موبائل پر پرنسپل نے رپورٹ کارڈ بھیجی تھی۔ اُسے دیکھ کر دماغ ہی گھوم گیا تھا اُسکا۔۔۔ وہ جتنی اُس پر محنت کر رہا تھا، اتنا ہی وہ ہر شے خراب کر رہا تھا۔ سپورٹس سے لیکر پڑھائی تک ہر جگہ اُسکی کارکردگی صفر تھی۔

''اُسکے ساتھ اس طرح کا سلوک کرو گے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو گا۔'' سفیر صاحب نے ناچاہتے ہوئے بھی کہا۔

''میں تو ہو گیا۔۔۔''شرٹ کی آستینیں فولڈ کرتے، اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''صرف پیسے کمانا کامیابی نہیں ہوتی۔''

''آپکی نظر میں تو وہی ہوتی ہے''اس طنز پر وہ چپ کے چپ رہ گئے۔ وہ صوفے سے ٹیک لگا کر ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہیں بیٹھ گیا۔

''صبح اسکول جاتا ہے، گھر آئے کچھ گھنٹے نہیں ہوتے کہ ٹیوشن چلا جاتا ہے، پھر آتا ہے تو آرام کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا اور قاری صاحب آجاتے ہیں۔ اُسے کچھ وقت باقی بچوں کی طرح بھی رہنے دو''اُنہوں نے ہمّت نہ ہاری۔

''اُسکے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔''

''اتنا سخت رویہ رکھنے میں اُسکی کیا بھلائی ہے؟''

''تا کہ اُسے سختیاں جھیلنا آئے۔ اُسے پیروں پر کھڑا کر رہا ہوں ابّا! کیونکہ اِس زمانے میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔۔۔ باپ بھی نہیں''اُس نے اُنکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ کرب اور اذیت کا سایہ سا اُنکے چہرے پر لہرایا تھا۔

''جو غلطی میں نے کی ہے، وہ تم نہ کرو علی!''وہ ہار مانتے ہوئے بولے۔

''مجھے پتہ ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''وہ اُن سے مزید بحث کرنے کے بجائے اُٹھ کر باہر آگیا۔ زندگی اُسکے لیے پہلے ہی بدمزہ ہو چکی تھی، اُسکی اپنی خواہشات تو کب کا مر چکی تھیں۔ اب صرف وہ اپنے بیٹے کو اُسکے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ اُسے زمانے کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بھول جاتا تھا کہ وہ بچہ ابھی ان تجربات سے گزرنے کے لیے بہت چھوٹا ہے۔ اُسے زمانے کا نہیں بلکہ صرف اپنے باپ کا تلخ رویّہ نظر آتا ہے، اور یہ رویّہ اُسے روز مارتا ہے۔ کبھی کبھی علی کو اپنے رویے کا احساس ہوتا تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں اُسکی ہر غلطی پر وہ اُسے پہلے سے زیادہ ڈانٹ دیتا تھا۔

باہر آکر بھی سکون نہ ملا تو گاڑی لیکر انجان راستوں پر نکل گیا۔ بہت دیر سڑکوں پر پھرتا رہا اور بلآخر ایک چائے کے ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی۔ اندر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ بس ایسے ہی رک گیا تھا۔ تب ہی اُسکی نظریں سامنے ٹیبل پر بیٹھے دو افراد پر گئی۔ اُس نے آنکھوں پر سے گوگلز ہٹا کر دوبارہ دیکھا، اُس نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ وہ رضا ہی تھا۔ بلیو جینز پر ہلکی براؤن رنگ کی ہائی نیک پہنے اور اُس پر گہرے براؤن رنگ کا کوٹ ڈالے وہ ہر طرح سے رضا الٰہی ہی تھا۔ لیکن حیران وہ اُسکے ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھ کر ہوا تھا۔ ایف آئی اے آفس میں ہوئی آخری بریفنگ نظروں میں گھوم گئی۔

مائیکل عرف فرمان، جو کہ پس منظر سے غائب ہو گیا تھا کل وہ ایک خلیل نامی شخص سے ملا ہے۔ خلیل کا سارا بائیو ڈیٹا ڈیپارٹمنٹ نے اکھٹا کر لیا ہے۔

فرّخ صاحب کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ کھچڑی بالوں والا شخص، جسکے ساتھ اس وقت رضا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ اور کوئی نہیں بلکہ وہی خلیل تھا، جسکی تصویر پچھلے ہفتے فرّخ صاحب نے اُنہیں دکھائی تھی۔ جسکے ذریعے مائیکل تک پہنچا جا سکتا تھا۔

بھلا رضا اسکے ساتھ کیا کر رہا تھا؟اور کیوں ؟اور جتنے سکون سے اُسکے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہا تھا،ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پرانے تعلقات ہوں۔

اُسکا دماغ کسی خطرے کا الارم بجا رہا تھا۔

''کیا مجھے نوید کو بتانا چاہیے؟ یا فرخ صاحب کو؟''اُس نے سوچا اور پھر موبائل نکال کر دور سے اُسکی اور خلیل کی تصویر اس انداز میں لی کہ وہ دونوں واضح نظر آرہے تھے۔پھر خاموشی سے وہاں سے نکل گیا۔ رضا سے ہزار شکوے صحیح لیکن اُسے اُمید نہیں تھی کہ وہ اس حد تک گر جائیگا۔

وہ دشمن سے تعلقات رکھ سکتا ہے؟اور اگر اُسے جانتا بھی تھا تو بتایا کیوں نہیں؟ وہ سب موت کے دہانے پر کھڑے تھے اور رضا ہر شے جانتے ہوئے بھی چھپا رہا تھا؟

ایک قدرے سنسان جگہ پر اُس نے گاڑی روکی اور موبائل باہر نکالا۔ تھوڑی دیر پہلے کی لی گئی تصویر نکال کے دیکھی۔ سمجھ نہیں آیا کیا کرے؟نوید کا نمبر اُسکے پاس نہیں تھا۔ایف آئی اے آفس جانا چاہیے یا نہیں؟

''پہلے مجھے اپنے طور پر رضا کی معلومات اکھٹی کرنی ہو گی۔آخر وہ کر کیا رہا ہے؟''کچھ سوچ کر اُس نے موبائل واپس ڈیش بورڈ پر پھینک دیا۔

اُسے یاد آرہا تھا۔۔۔رضا کا ماضی۔۔۔اُسکا پرانا بوسیدہ سا گھر،اُسکی کسم پرسی میں گزاری گئی زندگی۔۔۔اُسکے برے حالات۔۔

اور پھر رضا کا موجودہ حال۔۔۔

اُسکی ہر شے سے ٹپکتی امارت،اُسکا متکبرانہ انداز۔۔۔کوئی اتنے جلدی اتنا امیر نہیں ہو سکتا۔خصوصاً رضا جیسا شخص،جسکے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو۔جسکے سر پر نہ باپ ہو اور نہ جسکے پیچھے جائیداد۔۔۔

ہر سوال کا ایک ہی جواب علی کے پاس تھا۔۔۔

رضا یقیناً ان سب میں ملوث تھا۔

-------+--------+--------

سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتے وہ بلا ارادہ وہاں آکر رک گیا۔ نظر اٹھا کر اس خوبصورت مسجد کو دیکھا۔ نمازی جا چکے تھے،اوپر والے فلور پر حفاظ طلباء کی آوازیں آرہی تھیں۔وہ گاڑی بند کرتا مسجد میں داخل ہوا۔اس مسجد کا صحن خالی تھا۔اندر جانے کے بجائے وہ صحن میں بنی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔شدید سردی کی وجہ سے سیڑھیاں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ ہر احساس سے عاری بیٹھا تھا۔ذہن منتشر تھا اور دل خالی۔۔۔کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کرے؟ نہ جانے کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔جب کسی نے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

''حسین!''اُس نے سر اٹھا کے دیکھا،مسجد کے پیش امام صاحب کھڑے تھے۔

''ماموں!''وہ اُنہیں دیکھ کر کھڑا ہونے لگا لیکن انہوں نے اشارے سے روک دیا۔

''کیا کر رہے ہو یہاں؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' مختصر سا جواب دے کر سامنے دیکھنے لگا۔ وہ اُسکے برابر میں ہی بیٹھ گئے۔

''کیا بات ہے بیٹا؟ پریشان ہو؟'' اُنہوں نے پیار سے پوچھا تو اُس نے اُنہیں خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں ماموں! سمجھ نہیں آرہا کیا کروں؟ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ کوئی سبیل نہیں دکھتی۔۔۔'' وہ غیر واضع باتیں کر رہا تھا۔

''ایمان کیا ہے؟'' اُنہوں نے غیر متوقع سوال کیا۔

''جی؟'' اُسے سمجھ نہ آیا۔

''ایمان سے تم کیا مراد لیتے ہو بیٹا؟''

''اللہ پر یقین'' اُس نے جواب دیا۔

''یہ مسجد دیکھ رہے ہو؟ جانتے ہو اس کی بنیاد کس نے رکھی تھی؟'' ایک اور غیر متوقع سوال۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ جامع قرآن اکیڈمی ہے، اسکی بنیاد ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے رکھی تھی۔'' اُنہوں نے بتایا تو اس نے بس سر ہلا دیا۔

''وہ کہتے تھے کہ جب راستہ نظر نہ آئے تب اللہ پر یقین کرنا ایمان ہے۔ جب کوئی منزل نظر نہ آئے، تب اللہ پر یقین کرنا ایمان ہے۔ جیب میں پیسے ہوں اور دل میں اطمینان ہو تو بھروسہ کس پر ہوا؟ پیسوں پر؟ جب وسائل اور ذرائع نہ ہو تب یقین ہو کہ اللہ مسب الاسباب ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے، اسباب اُسکے محتاج ہیں۔'' اُنہوں نے مرحوم اسرار صاحب کے الفاظ دہرائیں۔

''تم جانتے ہو؟ اسرار صاحب نے کبھی حکومت سے اپنے لیے سیکیورٹی نہیں لی۔ حالانکہ اُنکی جان کو خطرہ تھا۔ اُنکے شاگردوں نے ایک بار اُنکے گھر کے باہر پولیس لا کھڑی کی، اُنہوں نے پولیس والوں کو واپس بھیج دیا۔ کیوں کہ وہ جنکے نقش قدم پر چلتے تھے، وہ میرے رسول ﷺ ہیں۔ میرے نبی ﷺ نے کبھی اپنی جان کے لیے کسی انسان پر بھروسہ نہیں کیا۔ پورا مکّہ خالی ہو چکا ہے، گھر کے باہر مشرکین مکہ کے سرداران موجود ہیں، لیکن آپ ﷺ اُنکے سامنے سے اُنکے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے چلے گئے۔ بھروسہ کس پر تھا؟ اللہ پر۔۔'' حسین نے تو انہیں کچھ نہیں بتایا تھا، پھر وہ کیسے سمجھ گئے کہ وہ اپنی جان کے لیے پریشان ہے؟

''حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: **کہ اگر ساری کائنات بھی اکھٹی ہو جائے، تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے، تو نہیں پہنچا سکتی مگر صرف تب، جب اللہ چاہے۔ اور اگر ساری کائنات اکھٹی ہو جائے کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچادے، نہیں پہنچا سکتی مگر اتنا ہی جتنا اللہ چاہئے۔** مومن کسی کی دھمکیوں میں نہیں آتا۔ کھلائے گا بھی اللہ، پہنائے گا بھی اللہ اور جان بھی وہی بچائے گا۔ یہ سارے کام اُسکے ہیں، تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ اللہ کے کام، اُسی کو کرنے دو۔'' کتنی پیاری بات کہی تھی اُنہوں نے۔

''تم نے پہلے بھی تو کتنے دکھ دیکھے تھے، لیکن تم کبھی پریشان نہیں ہوئے۔ تو اب کیوں ہوتے ہو؟ انسان تھک جاتا ہے، پریشان ہو جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ انسان ہے، فرشتہ تو نہیں۔۔۔ تھک جانا برا نہیں ہے، ایمان نہ ڈگمگائے کبھی۔۔۔'' حسین کے دل سے منوں بوجھ

سر کا تھا۔ منتشر ذہن یکدم ہی پر سکون ہو گیا، دل میں اطمینان اُتر آیا کہ زندگی اللہ نے دی ہے تو لے گا بھی وہی، یہ کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں کہ وہ اُسکی موت کا وقت لکھ دے۔

''شکریہ ماموں! آپ ہمیشہ مجھے حوصلہ دیتے ہیں۔''اُس نے احتراماً کہا تو وہ مسکرا دیئے۔

''چلو اب گھر جاؤ۔۔۔ پریشان ہو رہے ہوں گے سب''اُنہوں نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اُسے گھر واپس جانا تھا بلکل ویسے ہی، جیسے وہ روز جاتا تھا۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ۔۔۔

-------+--------+--------

''میں نے تمہیں جس شخص کی تصویر اور معلومات دی ہیں۔ اسکا ڈیٹا چاہیے مجھے''

''کس قسم کا ڈیٹا؟''

''یہ کیا کرتا ہے، پہلے کیا کرتا تھا؟ اسکا ذریعہ آمدنی، اُسکا حلقہ احباب، یہ کن کن لوگوں سے ملتا ہے اور۔۔۔''علی رکا۔

''اور؟''دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''اور اسکا کوئی کرمنل ریکارڈ۔۔۔''علی کو خود نہیں پتہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جو وہ کہہ رہا تھا اُس پر یقین کرنا اُسکے لیے خود بھی مشکل تھا۔ لیکن یہ پانچ زندگیوں کا سوال تھا۔ ہاں! پانچ زندگیاں۔۔۔ کیونکہ رضا کو تو وہ اس سب میں ملوث سمجھتا تھا۔

''ٹھیک ہے، ہو جائیگا۔ کام مشکل ہے اسی لیے تھوڑا وقت لگے گا۔ لیکن میں تمہارے لیے یہ کر دونگا''دوسری جانب سے یقین دلایا گیا۔

''دیکھو! کسی کو خبر نہ ہو کہ میں نے تمہیں یہ سب کرنے کو کہا ہے''

''تم فکر نہ کرو، تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں تمہارا کام پوری رازداری سے کروں گا''دوسری طرف سے یقین دلایا گیا تو اُس نے سر ہلاتے ہوئے فون رکھ دیا۔

''تم کیا کر رہے ہو رضا؟''نفرت اُسکے انگ انگ سے جھلک رہی تھی۔ رضا کا اپنی ذات پر لگایا گیا الزام، اُسے آج تک نہیں بھولا تھا۔

-------+--------+--------

C-189

''یہی نمبر تھا شاید۔۔۔''اُس نے گھر پر لگی تختی پڑھتے ہوئے کہا۔ پھر گاڑی سے اتر کر بیل بجادی۔ دروازہ چند سیکنڈ میں کھول دیا گیا تھا۔

''السلام علیکم! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔''مقدّس کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ جواباً وہ بھی مسکرایا اور پلٹ کر گاڑی سے مکرم کو نکالنے لگا۔

''تم اندر نہیں آؤ گے؟''اُس نے پوچھا۔

''نہیں مجھے دیر ہو رہی ہے''اُس نے معذرت کی۔

''واپسی کب ہو گی تمہاری؟''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوا۔

''واپسی پر تو وقت ہو گا نہ تمہارے پاس، نانی سے مل کر جانا''

''ٹھیک ہے''مکرم کو اُسکے حوالے کرتے ہوئے حامی بھری۔

''میرا چھوٹو۔۔۔''اُس نے مکرم کو اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے پیار کیا۔

''مکرم۔۔۔''وہ تصیح کرتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھا۔

''تمہارا آفس کہاں ہے؟''اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھولتا اُس نے ایک اور سوال پوچھا۔

''اسی شہر میں۔۔۔''اُس نے جان چھڑانی چاہی۔

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے، لیکن کس علاقے میں؟''

''ڈیفنس۔۔۔''مختصر جواب دیا۔

''کون سے فیز میں؟''

''تم نے کیا کرنا ہے؟''

''کبھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

''نمبر دے چکا ہوں میں تمہیں، اور میرا گھر بھی معلوم ہے تمہیں''

''کبھی ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم فون نہ اٹھاؤ اور گھر پر بھی نہ ہو تب؟''

''مقدّس! آج کے بعد سے تم ایک دن میں، مجھ سے صرف دس سوال پوچھو گی۔''اُس نے اچانک ہی کہا۔

''ہیں؟اِسکا کیا مطلب؟''وہ حیران ہوئی۔ گود میں لٹکا مکرم، آنکھیں گھما گھما کر دونوں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

''اِسکا مطلب کہ تمہارا آج سے دس سوالات کا کوٹہ ہو گا، دس سوال پورے ہونے پر میں ایک بھی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ تمہارے پاس نو سوال بچے ہیں''

''ارے ایسے کیسے؟ ابھی شروع کب ہوا تھا؟''وہ ہڑبڑائی۔

''جب تم نے پہلا سوال کیا تب، اب تمہارے پاس آٹھ سوال بچے ہیں'' کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھنے لگا۔

''مگر۔۔۔'' اُس نے کچھ بولنا چاہا۔

''ایک بھی سوال اور کیا تو سات سوال بچیں گے''دروازہ بند کرتے ہوئے اللہ حافظ کہا۔ اور گاڑی لے اُڑا۔

''تمہارا باپ واقعی بہت بد اخلاق ہے''اُس نے مکرم کو کہا تو وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔وہ اُسے پیار کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔یعنی اب اُس سے سوچ سمجھ کر سوال پوچھنا پڑیگا۔

-------+--------+--------

خاموش گھر، ویران راتیں اور اُداس صبحیں۔۔۔یہی زندگی وہ پچھلے کئی سالوں سے جی رہا تھا۔دل دکھی تھا۔

اور گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔وہ خاموشی سے چلتا عائمہ کے کمرے میں چلا آیا۔گلابی اور سفید امتزاج کا یہ کمرہ،اُس نے بہت پیار سے عائمہ کے لیے سجایا تھا۔اس کمرے کی ایک ایک شے سے محبّت ٹپکتی تھی۔ایک باپ کی محبت۔۔۔

دو ماہ سے عمر نے اپنی بیٹی کی آواز نہیں سنی تھی،اُسکا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔دل تڑپ رہا تھا اُس سے ملنے کے لیے۔روز سوچتا کہ عمارہ کو فون کرے، پھر رک جاتا کہ اگر وہ فون نہیں اٹھائے گی تو؟لیکن آج دل اتنا بے چین تھا کہ اُسے کال ملا ہی دی۔بیل جاتی رہی، جاتی رہی۔۔۔

اور جب اُسے لگا کہ وہ فون نہیں اٹھائے گی۔تب اُس نے فون اٹھالیا۔

''ہیلو!''عمر کی سانسیں بھی سماعت بن گئی۔

''کیوں فون کیا ہے؟''رکھائی سے پوچھا۔

''میں عائمہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔اُسے دیکھنا چاہتا ہوں''بے بسی سے کہا۔

''تم سے دور لے جانے کے لیے ہی میں اُسے یہاں لائی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ وہ تمھیں بھول جائے اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری اُس سے بات کروادوں؟''اُس نے ایسے کہا جیسے اُس کی ذہنی حالت پر شک ہوا ہو۔

''میں نہیں رہ سکتا اُسکے بنا عمارہ!۔۔اُسکی آواز ہی سنادو مجھے''اُس نے منت کی کہ شاید اُسے ترس آجائے۔

''وہ سو رہی ہے۔کل بات کروادوں گی''

''تم اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہو عمارہ؟''اُسے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

''اپنے کیے گئے ظلم کیوں بھول جاتے ہو عمر؟ہمیشہ خود کو مظلوم کیوں سمجھتے ہو؟''وہ چیخی تھی۔وہ چپ کا چپ رہ گیا۔اُسکی کوئی بھی وضاحت اُسکے اپنوں کا دل صاف نہیں کر سکتی تھی۔نہ عمارہ کا،نہ اسکے ماں باپ کا۔۔۔

''لیکن میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔کل ویڈیو کال پر بات کروادوں گی اُس سے۔۔۔خدا حافظ''اُسکا جواب سنے بنا ہی فون رکھ دیا۔صاف ظاہر تھا کہ اس سے مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

عمر تھک کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔بیڈ پر کچھ کپڑے رکھے تھے۔جاتے ہوئے جب عمارہ پیکنگ کر رہی تھی تو سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے اس نے بہت کچھ ایسے ہی یہاں چھوڑ دیا تھا۔وہ چیزیں اب تک وہیں رکھی تھیں۔عمر نے ہاتھ بڑھا کر عائمہ کے فراک اٹھالی۔یہ

فراک وہ اُسکی پہلی سالگرہ پر لایا تھا۔ اُسے پہن کر، چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی وہ کوئی گڑیا ہی لگ رہی تھی۔ اُس نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔ دوڑ دوڑ کر اُس کے پاس آتی تھی۔

اب وہ کہیں نہیں تھی۔۔۔ نہ اُسکے ننھے قدموں کی چاپ تھی۔۔۔ نہ اُسکی معصوم آواز تھی۔۔۔

وہ اُسکے لباس کو آنکھوں سے لگتا پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

کچھ غلطیوں کی سزا بہت بڑی ہوتی ہے۔ انسان کو ساری زندگی بھگتنی پڑتی ہے۔ وہ بھی وہی سزا بھگت رہا تھا۔

-------+--------+--------

شام کا وقت تھا، کراچی میں سردی کی بارش شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھی۔ لیکن جب ہوتی تھی دل موہ لیتی تھی۔ یہ بھی ایک ایسی ہی خوش قسمت شام تھی۔ جب ہلکی ہلکی بارش نے سردی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اپنے آفس میں بیٹھا مقدّم شیشے کے پار برستی بوندوں کو یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ پچھلے دنوں اتنا کام تھا کہ فرصت نہیں ملتی تھی، اور اب کام نہ ہونے کے برابر۔ اب وہ بس آفس کے اوقات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ نظریں گھما کے اپنے آفس کو دیکھا۔ کالے اور سرمئی رنگ کے امتزاج کا یہ آفس دراصل اُسکی نہیں، لیلیٰ کی پسند تھی۔ اُسکے گھر کی گہری نیلی اور آف وائٹ تھیم بھی در حقیقت لیلیٰ کے مزاج کے مطابق ہی تھی۔ اُسے رنگوں سے محبت تھی، اپنی ڈائری میں بھی رنگ برنگے مارکر اور پوائنٹر پین سے نہ جانے کیا کیا لکھتی رہتی؟ مقدّم کو اُسکی ہر ادا پیاری تھی۔

لیلیٰ یاد آئی تو آنکھوں میں کرچیاں چبھنے لگیں۔ ہاتھ بڑھا کر میز کا دراز کھولا اور اُس سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔ وہ لکڑی کا چھوٹا سا ڈبیا نما باکس تھا۔ مقدّم نے اُسے کھولا، جانتا تھا اندر کیا ہے۔ اُسکی اور لیلیٰ کی خون آلود تصویر اور اُسکے دو عدد جھمکے۔۔۔

اُس نے وہ تصویر نکالی، جا بجا خون کے دھبوں کے باوجود بھی لیلیٰ کا چہرہ واضح تھا۔

شہد رنگ بڑی بڑی غزالی آنکھیں۔۔۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُسے ہی دیکھ رہی ہو۔

''تمہاری چوائس بہت خراب ہے مقدّم! میں جب اس گھر میں آؤں گی نہ، اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گی سب کچھ۔۔۔'' کبھی کا کہا ہوا اُسکا جملہ کانوں میں گونجا۔ تصویر واپس رکھ کر اُسکے جھمکے نکال لیے۔

''ہمیشہ کیوں پہنے رکھتی ہو انہیں؟'' مقدّم نے پوچھا تھا۔

''کیوں کہ تم نے دیئے ہیں'' مسکرا کے کہتی وہ اُسے اپنی اپنی لگی تھی۔

''اور خراب ہو گئے تو؟''

''تم اور لا دینا'' فوراً سے جواب آیا تھا۔

دل درد کر رہا تھا۔۔۔ لیلیٰ نہیں تھی۔

دنیا میں کہیں نہ تھی۔

کسی کونے میں نہ تھی۔۔۔

اُسکی آواز نہ تھی۔۔۔

اُسکی باتیں نہ تھی۔

سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ اُس نے سامان ڈبیا میں ڈال کر واپس دراز میں رکھ دیا۔ کیا فائدہ خود کو اذیت دینے کا؟ وقت دیکھا تو ابھی بھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ تھک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ واپسی پر مکرم کو بھی لینا تھا، مقدّس کی نانی سے بھی ملنا تھا۔ زندگی کسی کے لیے نہیں رکتی، اُسکی بھی نہیں رکی تھی۔ رک جاتی اگر مکرم نہ ہوتا۔۔۔

شہد رنگ بڑی بڑی غزالی آنکھوں والا مکرم نہ ہوتا تو شاید اُسکی زندگی بھی رک جاتی۔۔۔

اُسکی آنکھیں ہی تھیں جو مقدّم کو زندہ رکھے ہوئی تھیں۔

-------+--------+--------

''بابا! بابا!۔۔۔'' احمد چلاتا ہوا تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تھا، اُسکے ہاتھوں میں علی کا موبائل تھا۔ سکون سے اپنے بستر پر لیٹ کے، ٹی وی پر کوئی ضروری ٹاک شو دیکھتے علی نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے اندر آنے کا؟''

''بابا آپکا فون۔۔۔'' اُس نے مسلسل بجتا ہوا موبائل اُسکے سامنے کرنا چاہا۔

''پہلے میری بات کا جواب دو، کیا تمہیں دستک دے کر نہیں آنا چاہیے تھا؟'' اُسے موبائل کی مطلق پرواہ نہ تھی۔

''جی۔۔'' ہمیشہ کی طرح سر جھکا کے یہی کہا۔ موبائل بج بج کے خاموش ہو چکا تھا۔

''دو موبائل۔۔۔'' ہاتھ بڑھا کے موبائل مانگا، احمد کے ہاتھ کانپے اور موبائل نیچے گر گیا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' وہ جھنجھلایا ''کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے'' وہ گھبرا کے موبائل اٹھانے لگا۔ صد شکر کے وہ قالین پر گرا تھا۔

''جاؤ اب یہاں سے۔'' اُس نے موبائل اُسکے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے کے علی موبائل آن کرتا کال دوبارہ آنے لگی۔ نمبر دیکھ کر وہ سیدھا ہوا۔

''ہیلو! کیسے ہو علی؟'' فون کی دوسری جانب سے آواز آئی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ کیا اطلاعات ہیں؟''

''کام مکمل ہو گیا ہے۔ رضا الٰہی کی معلومات اکھٹی ہو گئی ہیں۔ میں تمہیں بھیج رہا ہوں دیکھ لینا۔''

''کوئی مشکوک بات تو معلوم نہیں ہوئی؟'' اُس نے جاننا چاہا۔

''کرمنل ریکارڈ تو کوئی نہیں ہے اُسکا، سب کلیئر ہے۔ البتہ۔۔۔'' وہ رکا

''البتہ ؟'' وہ بے چین ہوا۔ کچھ گڑبڑ تھی۔

''وہ ماضی میں rehab سینٹر میں رہ چکا ہے۔ نشے کے علاج کے لیے۔۔۔''

''واٹ ؟'' اُس کو جھٹکا لگا تھا۔

''ہاں ! کافی لمبا علاج چلا ہے اِسکا، عادی نشئی تھا یہ، اور یہ جو تصویر تم نے مجھے بھیجی ہے۔ اس میں ایک دوسرا شخص بھی موجود ہے، اُسکا نام خلیل ہے۔ یہ ایک چھوٹا موٹا ڈرگ ڈیلر ہے۔ رضاالٰہی اسی سے ڈرگز خریدتا تھا۔ کافی پرانے تعلقات ہیں ان دونوں کے۔'' وہ تفصیل سے بتا رہا تھا۔ اور علی کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی تھی۔

-------+--------+--------

(جاری ہے)

نحل کی ساتویں قسط اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو میری پیج اور ویبسائٹ پر شائع کی جائیگی (ان شاءاللہ)